کتابوں کی درس گاہ میں

ہزاروں صفحات کے مطالعہ سے منتخب دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات و عبارات
علمی لطائف و نکات، سبق آموز قصے، بصیرت افروز معلومات۔ ایک ایسی کتاب
جس کا مطالعہ آنکھوں میں آنسو بھی لاتا ہے اور ہونٹوں پر تبسم بھی، جو بہترین رفیقِ حضر
بھی ہے اور خوش گوار رفیقِ سفر بھی!

ابن الحسن عباسی

مکتبہ عمر فاروق
بالمقابل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی، کراچی ۲۵

کتابوں کی درس گاہ میں

ہزاروں صفحات کے مُطالعہ سے مُنتخب دلچسپ اور عبرت انگیز واقعات و عبارات
علمی لطائف و نکات، سبق آموز قصّے، بصیرت افروز معلومات۔ ایک ایسی کتاب
جس کا مُطالعہ آنکھوں میں آنسو بھی لاتا ہے اور ہونٹوں پر تبسم بھی، جو بہترین رفیقِ حضر
بھی ہے اور خوش گوار رفیقِ سفر بھی!

ابن الحسن عبّاسی

مکتبۂ عمرِ فاروقؓ
بالمقابل جامعہ فاروقیہ شاہ فیصل کالونی، کراچی ۲۵

انتساب

والد کے نام جن کی یاد ستاتی اور محبت رلاتی رہتی ہے!

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب سرد ہوا چلی، میں نے تجھے یاد کیا

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر

دوران مطالعہ نظر سے گذرنے والے مختلف دلچسپ واقعات، علمی لطائف اور اثر انگیز عبارتوں کا منتخب مجموعہ "کتابوں کی درس گاہ میں" آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ کوئی تحقیقی یا فکری مضامین سے متعلق کتاب نہیں بلکہ مختلف اوقات، مطالعہ کرتے ہوئے جو واقعات ولطائف دل کو بھائے، انہیں جمع کر دیا اور اس مقصد کے تحت اب اس مجموعے کو شائع کیا جارہا ہے کہ عبوری اور ہلکے پھلکے مطالعہ کے لئے شاید یہ مفید رہے، ان واقعات کا انتخاب کسی متعین اور خاص معیار کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا گیا بلکہ جس واقعہ اور تحریر نے دل ودماغ پر ضرب لگائی، خوابیدہ جذبے کو لرزش دی، سوئی ہوئی امنگ کو بیدار کیا اور غفلتوں کے خاکستر میں دبی ہوئی چنگاری کو فروزاں کیا، اسے لے لیا گیا

بہر تسکین دل نے رکھ لی ہے غنیمت جان کر
جو جنبش بوقت ناز تیری آبرو نے کی

انسان درحقیقت بہت خود پسند واقع ہوا ہے، وہی شعر گنگناتا اور اسی نثر پر اس کی نگاہ انتخاب ٹھہرتی ہے جس میں وہ اپنے خیالات کی تعبیر اور اپنے جذبات کی ترجمانی محسوس کرتا ہے، اس کا دامنِ دل، اسی صدا کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے جو اس کے احساسات کو لفظوں کی زبان اور اس کے شعور کو اظہار وبیان عطا کرتی ہو کہ اس کو عزیز اپنا خیال اور محبت اپنے جذبے سے ہے اور چونکہ ہر دل کا احساس اور ہر ایک کی پسند کا معیار الگ ہوتا ہے، اس لئے ضروری نہیں کہ اس میں ذکر کردہ ہر ٹوٹا، ہر تراشہ اور ہر پراچہ، آپ کا بھی پسندیدہ انتخاب ہو۔ کتاب میں بعض لطائف اور ظریفانہ باتوں کے لکھنے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ

نہیں کہ قاری کا مطالعہ جب وہاں تک پہنچے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی چلی جائے، تفنن طبع کے لئے کہیں کہیں نظمیں اور اشعار بھی لکھدیئے گئے ہیں۔

کتاب کے اسلوب کے متعلق یہ بات ملحوظ رہے کہ اس میں اردو کی بیسیوں کتابوں کی عبارتیں اور اقتباسات آئے ہیں اس لئے ایک اسلوب کے بجائے اس میں آپ کی نظر سے مختلف اسالیب گذریں گے، آج سے اسی نوے سال پرانی زبان کی عبارتیں بھی آپ پائیں گے اور آج کی روزمرہ زبان کا اسلوب بھی اس میں آپ کو ملے گا، جن کتابوں سے واقعات لئے گئے ہیں جلد اور صفحہ نمبر کے ساتھ ان کا حوالہ دیدیا گیا، آخر میں ان کتابوں کی فہرست بھی دیدی گئی ہے جن کی تعداد تقریباً سو ہے۔

☆☆☆☆

اکثر واقعات اسلام کی شاندار لہلہاتی تاریخ سے لئے گئے ہیں، اسلام کی تاریخ، کوئی منجمد تاریخ نہیں اور نہ ہی اسلامی تعلیمات صرف نظریاتی اور فلسفیانہ افکار ہیں، تاریخ اسلام ان ابدی تعلیمات کا عملی نمونہ ہے جو قیامت تک کے لئے ہیں اور قیامت تک رہیں گی، ان دائمی صداقتوں کی عظمت کے سامنے سر تسلیم، خم کرنے والے جب اٹھ جائیں گے، ختم ہو جائیں گے تو اس ہنستی بستی دنیا، اس رنگ رنگ جہاں، اس بوقلموں کائنات کے وجود کا کوئی جواز نہیں رہے گا، کوئی وجود نہیں رہے گا، یہ سب کچھ ملیامیٹ کر دیا جائے گا، تب اس کی تخلیق کا مقصد ختم ہو چکا ہو گا۔

اسلام کے بلند اخلاقی نظام کے چند نمونے کتاب میں آپ کی نظر سے گذریں گے...... اسلامی تہذیب کے کچھ روشن مینار اس میں آپ کو نظر آئیں گے، ایسے مینار جو شاہراہ حیات کے مسافروں کے لئے قندیل ایمانی کا کام دیتے ہیں...... جن سے زندگی کی پرپیچ وادیوں میں بھٹکنے والے راہی، سمت منزل کی تعیین میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، وحشتوں کی دھوپ میں جھلسنے والے جہاں آکر سکھ کا سانس لے سکتے ہیں، سکون کی ساعتیں گذار سکتے

ہیں۔

اسلام کے پیروکار اس وقت صنعتی، اقتصادی، سائنسی ترقی کی رو سے یقیناً دورِ زوال میں ہیں، مغرب کی علمی و صنعتی برتری ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، اس صنعتی برتری سے فائدہ اٹھا کر مغربی تہذیب بھی، اپنی پوری چمک دمک، آب و تاب کے ساتھ، اسلامی تمدن، اسلامی روایات، اسلامی اخلاق واقدار پر حملہ آور ہے اور اس تلخ حقیقت کے اعتراف کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہونی چاہئے کہ یہ تہذیب عالم اسلام کے ایک بڑے طبقے پر فتح حاصل کر چکی ہے، اس کی تابانیوں کے سامنے، اس کی آنکھیں خیرہ، اس کا دل گرویدہ، اس کا دماغ مسحور اور اس کا شعور مفلوج اور مکمل مفلوج ہو چکا ہے، بد قسمتی سے اسلامی اور مغربی کلچر و گلیمر کے کارزار میں بری طرح شکست کھانے والا یہ طبقہ اسلامی ملکوں کا مرفہ الحال، صاحبِ حیثیت اور صاحبِ اقتدار طبقہ ہے، مسلمانوں کے اس جدید تعلیم یافتہ...... اور صحیح لفظوں میں ...... مغربی تعلیم یافتہ طبقے کا مغربی تہذیب واخلاق سے اس طرح متاثر ہونا ایک المیہ ہے، عظیم المیہ، انسانیت کا المیہ، عالمِ اسلام کا المیہ، اسلامی تاریخ کا المیہ!!

افسوس کی بات یہ ہے کہ اس بدیہی حقیقت کی طرف اس طبقے کی نظر نہیں گئی کہ وہ محروم القسمت شخص جس نے زندگی، مادی ترقی کی جزئیات تک سے آگاہی میں گذاری، کائنات کے سربستہ رازوں سے واقف رہا، اقتصادی بلندیوں پر پہنچا، صنعتی انقلاب کے نقطۂ عروج سے ہو آیا، جدید سہولتوں سے زندگی کی تلخیوں اور مشقتوں کو رام کیا...... لیکن ایمان کی سعادت سے محروم اور آخرت کی دائمی زندگی میں کام آنے والی متاعِ بے بہا سے تہی دست ہو کر مرا، ناکام اور یقیناً ناکام، خسارے اور مکمل خسارے میں ہے اس مؤمن کے مقابلے میں جس کی زندگی نے پسماندہ بستیاں دیکھیں، اجڑے دیار، خستہ مکانات دیکھے، ٹھنڈے چولھے، کچی دیواریں، تپتی ٹپکتی چھتیں، پھٹے گلیم، بوسیدہ پوشاک، ٹوٹے پل، بنجر کھیت، جلے جنگل، ویران زمینیں...... آسائشوں سے خالی مشقتوں کے قافلے، بیماریوں کے طویل سلسلے دیکھے، سفر کی صعوبتیں دیکھیں، حضر کی تکلیفیں دیکھیں، دن دیکھے جن کا کوئی پرسان نہیں تھا، راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں تھی...... لیکن جب دنیا سے اس کے

رخصت ہونے کا وقت آیا تو زندگی کے ہزار طوفانوں کے باوجود اس درماندہ اور تھکے ماندہ مسافر کے دلِ بے تاب میں ایمان کا چراغ روشن تھا اور اس ابدی سعادت کی مشعل ساتھ لے کر وہ اس جہاں سے رخصت ہوا...... لاریب یہ مؤمن کامیاب و کامران ہے، فتح یاب و بامراد ہے۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے، ارشاد ہے:

ولا تمدن عينيك الى مامتعنابه ازواجا منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى۔

"اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھئے، جو ہم نے کفار میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کے لئے دی ہیں یہ تو صرف دنیوی زندگی کی رونق ہے (اور اس لئے دی ہے) تاکہ ہم انہیں اس میں آزمالیں اور (آخرت میں آپ کو ملنے والا) آپ کے رب کا عطیہ زیادہ بہتر اور بہت باقی رہنے والا ہے"

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿لايغرنك تقلب الذين كفروا فى البلادO متاع قليل ثم مأواهم جهنم وبئس المهادO لكن الذين اتقوا ربهم لهم جنت تجرى من تحتها الانهر خلدين فيها نزلا من عندالله، وما عندالله خير للأبرارO﴾

"تجھے ان کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا (اور ان کی گہما گہمی) دھوکے میں نہ ڈالدے کہ یہ تو چند دنوں کی بہار ہے (مرنے کے بعد) پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے، لیکن جو لوگ مؤمن متقی ہیں، ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہ لوگ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے (ان کی) مہمانی ہوگی اور جو

کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ نیکوکاروں کے لئے بہت ہی بہتر ہے"۔

وہ مسلمان مفکرین و مصنفین جو مرعوبیت کی بنا پر اپنے تہذیبی ورثے اور اخلاقی میراث کے متعلق نہ صرف یہ کہ خود احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں بلکہ دوسروں کو بھی مغربی تہذیب کی برتری کا درس دیتے ہیں، جن کی تحریروں میں چودہ سو سال پر پھیلی ہوئی بے مثال اسلامی تاریخ کی عبقری شخصیات، تاریخ اسلام کے عظیم الشان کرداروں اور اس کی لافانی سچائیوں کی خوشبو نہیں مہکتی، بلکہ وہ گذشتہ دو صدیوں میں گذرنے والے مغربی مفکرین اور یہودیت و عیسائیت کے علمبردار مستشرقین کے افکار و اقوال نقل کرنے میں فرماں بردار شاگردوں کا رول ادا کر رہے ہیں، انہیں کون بتائے کہ:

برخودؔ نظر کشاز تہی دامنی مرنج
در سینۂ تو، ماہِ تمام نہادہ اند

انہیں کون سمجھائے کہ:

جسے حقیر سمجھ کر تم نے بجھا دیا
وہی چراغ جلے گا تو روشنی ہو گی

انہیں کون اس حقیقت سے آگاہ کرائے کہ دنیا کے سنگریزے جمع کرنے کی غرض سے شرفِ انسانیت کے نیلام میں بولی لگانے کے لئے آگے بڑھنے والے بد نصیب اس دولت سے محروم ہیں جو ایمان کے سعادت مندوں اور اسلام کے خوش نصیبوں کو حاصل ہے، صنعتی وسائل، سائنسی تجربات اور مادی ترقی میں مغرب سے استفادے کی ضرورت اور حاجت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن جہاں تک تعلق ہے عقیدے، تہذیب، اخلاق اور زندگی کی اقدار و روایات کا، اس میدان میں دنیا کا کوئی مذہب اسلام کا مقابل نہیں ہو سکتا، اسلام کی تہذیب و ثقافت اور قدروں کا خورشید جہاں جہاں سے گذر گیا، وہاں وہاں سحر ہوئی، جہاں جہاں سے گذرے گا، وہاں وہاں سحر ہو گی۔

بد قسمتی سے اس وقت روئے زمین پر کوئی ایک بھی مسلمان ملک ایسا نہیں جو ایک طرف جدید مادی ترقی سے مکمل آراستہ ہو، دوسری طرف وہاں اسلام، مغربی تہذیب کی

پرچھائیوں سے بالکل محفوظ وسالم زندگی کے تمام شعبوں میں پورا پورا نافذ اور حاوی ہو...... جو شخص یا جو جماعت کسی ملک میں ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل میں کامیاب ہو جائے گی جس میں صنعتی، سائنسی، ٹیکنالوجی اور مادی ترقی پورے عروج پر ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب وتمدن، اسلامی اخلاق وثقافت کسی تحریف وتاویل کے بغیر رائج ہو، ایک ایسا مسلمان معاشرہ جس میں مغرب کے بظاہر خوشنما لیکن در حقیقت جذام زدہ نظامِ اخلاق وتہذیب سے مرعوبیت کا ذرہ بھر شائبہ نہ ہو، مادی وسائل سے لیس ہونے کے ساتھ اس میں اسلام کی ایک ایک تعلیم اور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو زندگی کے ہر ہر شعبے میں پورے فخر، مکمل یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ اختیار کیا ہو، اس بارے میں کسی قسم کی مداہنت، مصلحت، معذرت اور رواداری کی گنجائش کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو...... ایسا مسلمان معاشرہ جو دورِ جدید کے تقاضوں سے مکمل ہم آہنگ ہونے کے باوصف دوسری قوموں کی تہذیبوں کو پورے احساسِ برتری کے ساتھ یہ کہہ کر رد کر دیتا ہو کہ...... انترك سنة نبينا لهؤلاء الحمقاء (کیا ہم اپنے نبی سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ان احمق قوموں کی تہذیب کی خاطر ترک کر دیں؟)(۱)

---

(۱) یہ وہ الہامی جملہ ہے جو مشہور صحابی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب کفار کی ایک سپر طاقت کے شاہی دربار میں کھانا کھاتے ہوئے ان کے ہاتھ سے لقمہ گرا، آپ نے سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تعلیم کے مطابق لقمہ اٹھا کر صاف کیا اور کھالیا، اس پر قریب بیٹھے ہوئے کسی شخص نے تنبیہ کی کہ گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھانا دربارِ شاہی کے آدابِ طعام کے منافی ہے اور اس عمل سے یہ لوگ مسلمانوں کے حرص وافلاس پر بھی استدلال کر سکتے ہیں، تب حضرت حذیفہؓ نے یہ ایمان افروز جملہ ارشاد فرمایا...... أنترك سنة نبينا لهؤلاء الحمقاء...... یہ تھا راہِ حق کا وہ قافلہ جو اسلام کی ایک ایک تعلیم اور پیغمبرِ اسلام کی ایک ایک سنت کو پورے یقین اور بھرپور اعتماد کے ساتھ لے کر اٹھا، دنیا کی کسی تہذیب کا کوئی جلوہ، ان کی آنکھ کو خیرہ نہ کر سکا، نتیجتاً دیکھتے ہی دیکھتے روئے زمین کا چپہ چپہ دینِ اسلام کے زمزمے سے مخمور اور توحید کے نغمے سے معمور ہوا...... آج مسلمانوں کی گم گشتہ عظمتوں کی اسی تاریخِ رفتہ کو دہرانے اور پھر سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے، لن يصلح آخر هذه الأمة الا بما صلح به أولها......

ان اوصاف کا حامل معاشرہ دورِ جدید کا وہ کامیاب ترین تاریخی معاشرہ ہو گا جسے تشکیل دینے اور بازیافت کرنے والوں کے سر بلاشبہ ایک تجدیدی کارنامے کا سہرا ہو گا اور جس کی آغوش میں سکون پانے کے لئے سسکتی انسانیت پروانہ وار ٹوٹ پڑے گی اور بجا طور پر کہہ سکے گی کہ:

مسرور بام و در ہے تو خنداں کلی کلی
بٹتی ہیں تیرے شہر میں خوشیاں گلی گلی

اسلام کے اسی بلند اخلاق و روایات کے حاملین کی ایک جھلک آپ کو ان واقعات میں نظر آئے گی جو کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

گزشتہ سے پیوستہ رمضان (۱۴۱۹ھ) میں اس کتاب کا اشتہار میرے مضامین کے مجموعے "التجائے مسافر" کے آخر میں چھپ گیا تھا، اس کے بعد مخلص اور محبت کرنے والے قارئین اس کی طباعت کے متعلق مسلسل دریافت کرتے رہے۔

"اب چھپی جب چھپی" کا جواب سن سن کر کئی احباب مایوس بھی ہو گئے لیکن ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے، اب اللہ جل شانہ کے فضل و کرم سے کتاب چھپ کر آگئی، اس قدر تجسس اور انتظار کے بعد اس کا مطالعہ آپ کے لئے ٹھیک اسی طرح مفید بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ آپ کی توقع تھی اور مطالعہ کے بعد آپ کا تاثر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں...... میں...... میں سوائے دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اس کتاب کو آپ کے لئے مفید بنائے، اس فائدہ کے نتیجے میں کسی پڑھنے والے نیک بندۂ خدا کی مقبول دعا کے دو بول نصیب ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر کسی محنت کی اور قیمت کیا وصول ہو سکتی ہے، ورنہ لفظوں کی اس ہیرا پھیری کو آپ پانی کا بلبلہ کہہ سکتے ہیں جو اٹھتا ہے، کچھ چلتا ہے، فنا ہو جاتا ہے، بہتی ندی کے کنارے ابھرنے والے

جھاگ سے تعبیر کر سکتے ہیں جو خشکی تک پہنچتا بھی نہیں کہ ختم ہو جاتا ہے، ٹمٹماتے چراغ سے اس کی مثال دے سکتے ہیں جو چند بھڑ کیں مار کر تاریکی کا حصہ بن جاتا ہے، بے ثباتی میں ایسے جاں بلب مریض سے بھی اس کی تشبیہ دے سکتے ہیں جس کا جانا ٹھہر گیا ہے، صبح گیا، شام گیا...... سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو وفات کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا، کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے جو جواب دیا، اس میں صرف الفاظ کی ہیرا پھیری کرنے والوں کے لئے عبرت بھی ہے اور موعظت بھی، فرمایا:

طاحت تلك الإشارات، وغابت تلك العبارات، وفنيت تلك العلوم، ونفدت تلك الرسوم، ومانفعنا الاركعات كنانركعها في الأسحار۔

"وہ اشارے مٹ گئے، وہ عبارتیں غائب ہو گئیں، وہ علوم فنا ہو گئے اور وہ نقوش ختم ہو گئے، ہمیں تو صرف ان چند رکعتوں نے فائدہ دیا جو ہم سحری کے وقت پڑھا کرتے تھے"

اللہ جل شانہ اس کتاب کو مقبولیت عطا فرمائے، مفید بنائے اور مجھ ناکارہ کے لئے اسے اس دن کا ذخیرہ بنائے، جس میں نہ جاہ وشہرت کام آئے گی، نہ مال و دولت!

ابن الحسن عباسی

۵ رمضان ۱۴۲۱ھ

☆☆☆☆☆☆

فہرست

نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی ۲۳
چراغ محبت ۳۱
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا ۳۵
ہم نے کانٹوں میں بھی گلزار کھلار کھا ہے ۴۳
غم زیست کا حاصل ہے اس غم سے مفر کیوں ہو ۴۵
کھلا در ۴۵
دل دشمناں سلامت، دل دوستاں نشانہ ۴۶
غیبت سے بچاؤ کا نسخہ ۴۶
آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ ۴۷
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ ۴۸
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ ۴۹
تقدیر کا قاضی ۵۰
زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی ۵۱
حق پسند ۵۱
غم آخرت کا چراغ ۵۱
پسند آئی انہیں اک ادائے عاشقانہ ۵۲
ایک قلم کے لئے ۵۳

پاکباز و بے نیاز ۵۳
اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیا لے کر ۵۴
مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو ۵۶
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود ایاز ۵۷
گام گام احتیاط ۵۸
جو اس در کا بھکاری ہے وہ قسمت کا سکندر ہے ۵۸
آئے تھے ان کو ڈھونڈنے خود سے بھی بے خبر گئے ۵۹
خوف خدا سے چشمہ صد رنگ ابلتے دیکھا ۶۱
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم ۶۲
حق وفا ہم ادا کر چلے ۶۳
سر مقتل وہ صدا کر چلی ۶۴
چمن کے تخت پر جب شہ گل کا تجمل تھا ۶۵
فکر آخرت کے آنسو ۶۶
عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جان ۶۷
حسن خاتمہ ۶۸
اپنی کوئی ملک نہ املاک سمجھنا ۶۸
بہشت کے باسی ۶۹
آواز دی خزاں نے تو بھی نظر میں ہے ۷۰
بہترین و بدترین ۷۱
کوئی غم گسار ہوتا، کوئی چارہ ساز ہوتا ۷۱
افسوسناک اجتہاد کا خوشگوار نتیجہ ۷۲
بت خانہ بھی رہا، کبھی یہ کعبۂ دل ۷۲
ہونا ہے تمہیں خاک سب خاک سمجھنا ۷۳

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں میناا سی کا ہے............ ۷۴
مجھے ہے حکم اذان لاالہ الااللہ.............. ۷۵
فقر وغنا کی کسوٹی.................. ۷۶
امید کرم.................. ۷۶
فراست.................. ۷۷
فصل گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد.............. ۷۸
بدعت کاار تکاب ڈاکو بھی نہیں کرتا.............. ۷۹
تلخ نوائی میری چمن میں گوارا کر.............. ۸۰
ایثار وہمدردی کاایک انوکھاواقعہ.............. ۸۵
بسم اللہ کی تاثیر.................. ۸۷
خوگر صدق و صفا.................. ۸۸
افلاک سے آتا ہے نالوں کاجواب آخر.............. ۸۸
آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے.............. ۹۰
استغفار کی برکات.................. ۹۱
چشم خطا پوش.................. ۹۲
ایک آشیانے کے لئے.................. ۹۳
میر کارواں ہو تو ایسا.................. ۹۳
غیرت مند ہاتھی.................. ۹۴
جن سے عجیب فرمائش.................. ۹۶
بھولی بھالی.................. ۹۷
ستم سے زیادہ کرم یاد آیا.................. ۹۸
ایک بار جو بھٹکا تو بھٹکتا ہی رہے گا.............. ۱۰۱
پھروں نہ حشر کے میدان میں اجنبی کی طرح.............. ۱۰۲

حافظہ ۱۰۴
اعتماد کا کرشمہ ۱۰۴
ماحول کا اثر ۱۰۵
بدلتا ہے رنگ دل کیسے کیسے ۱۰۷
داغ یتیمی ۱۰۹
شک وتردد سے نجات کا حل ۱۰۹
ہمہ دانی کا بھرم ۱۰۹
حیرت انگیز حافظہ یا خوبصورت جھوٹ ۱۱۰
جھوٹی دلیل ۱۱۱
چار مرد چار خواہشات ۱۱۱
ہوں گی اے لفظ محبت! تیری تعبیریں بہت ۱۱۲
وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ ۱۱۳
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز ۱۱۴
جوہر خطابت ۱۱۵
فیشن کی شناخت ۱۱۶
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ۱۱۷
بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا ۱۱۸
مکافات عمل ۱۱۸
بے بسی ۱۲۱
بلا عنوان ۱۲۱
......دل کو جلاتا ہے ۱۲۳
خاندانی مزاج کا اثر ۱۲۳
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر ۱۲۵

بادشاہ لوگ ۱۲۶
وطن پرست ۱۲۶
......ابھی چمک باقی ہے ۱۲۸
کردار کا غازی ۱۳۰
درویش صفت ۱۳۲
دنیا میں کسی کی بھی یکساں نہیں گذری ۱۳۴
یہ آشیانہ کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو ۱۳۵
درد و الم سے بے نیاز، میں محو جمال یار ہوں ۱۳۷
احساس کمتری ۱۳۸
غلامان فرنگ ۱۳۸
بزرگوں کے جوابات عجیب ہوتے ہیں ۱۴۱
مہربان کیسے کیسے ۱۴۳
اخلاق کا اثر ۱۴۳
پیکر ایثار و ہمدردی ۱۴۴
نرالی ٹوک ۱۴۵
حجاج کے ساتھ ایک دیہاتی کی حکیمانہ گفتگو ۱۴۵
دل کا حال ۱۴۶
غلط فہمی ۱۴۷
اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں ۱۴۸
میرے لئے دین عزیز تر ہے ۱۴۹
فضول گوئی ۱۵۱
تقریر اور تکرار ۱۵۱
جس کے لئے...... .... ۱۵۲

حکیمانہ دعا.......... ۱۵۲
بصیرت افروز جواب کی تاثیر.......... ۱۵۲
طاؤس و رباب آخر.......... ۱۵۴
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے.......... ۱۵۶
وہ داستان سنائی کہ دامن بھگو دئے.......... ۱۵۷
بساطِ سخن میں درد کی شمع جلائے رکھنا.......... ۱۵۹
سکون حرام ہے میرے انہدام کے بعد.......... ۱۶۱
سورۂ یٰسین کی برکت.......... ۱۶۳
نیت کا اثر.......... ۱۶۵
صبح.......... ۱۶۷
آسان حل.......... ۱۶۹
نگاہِ شوق اگر ہے شریکِ بینائی.......... ۱۷۰
نقل صحیح.......... ۱۷۱
ایک واقعہ دو سبق.......... ۱۷۳
بڑا انسان بڑا بچہ نہیں ہوتا.......... ۱۷۴
تحفۂ حجاز......آبِ زمزم.......... ۱۷۵
عقلمند مجذوب.......... ۱۷۶
لسان الغیب.......... ۱۷۸
خاک قربت پر گلستان صد رنگ کھلتے دیکھا.......... ۱۷۹
عفیف عاشق.......... ۱۸۰
ذوق لطیف.......... ۱۸۳
ادب.......... ۱۸۵
چرچا بادشاہوں میں ہے.......... ۱۸۵

علم کی عزت افزائی ۱۸۵
محروم العقل ۱۸۶
فانی دنیا کے پجاری ۱۸۷
کتابیں ہیں چمن اپنا ۱۸۸
آپ کی امانت محفوظ ہے ۱۸۹
عظیم باپ، عظیم بیٹا ۱۹۰
مرد دانا پر کلام نازک کا اثر ۱۹۱
حفاظت قرآن ۱۹۲
مقصد سے لگن ۱۹۲
عقیدت ۱۹۳
ہوس چھپ چھپ کر بنالیتی ہے تصویریں ۱۹۴
بصیرت......دل کی بینائی ۱۹۴
تخت والوں سے بھی اونچے ہیں ترے خاک نشین ۱۹۶
محبت کا کرشمہ ۱۹۸

☆☆☆☆☆☆

۲۳

نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

مجاہدینِ اسلام کی تاریخ ایک ولولہ انگیز اور روح پرور تاریخ ہے، اللہ کی زمین سے اللہ کے باغیوں کو ختم کرنے، مفسدین کا صفایا کرنے اور بتانِ آزری کے پجاریوں کے شر کو مٹانے کے لیے دینِ اسلام کے علم برداروں نے جو ایمان افروز معرکے سر کیے، تاریخ اسلام کے گلشن کا چپہ چپہ عہدِ وفا کی ان داستانوں سے لہلہا رہا ہے

مادی فلسفہ کی اس تعبیر میں کسی کے لیے شک کی گنجائش نہیں کہ انسان کی زندگی کی سب سے عزیز متاع خود اس کی زندگی ہے، جہاں کی ساری دلچسپیاں، ساری رونقیں اور ساری نیرنگیاں اسی وقت تک ہیں جب خود اس کے جسم و جان، اس کے قلب و جگر اور فکر و نظر میں شادابی کی کوئی امنگ اور زندگی کی کچھ رمق باقی ہو، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تم باغ میں جاتے ہو، سبزہ کو دیکھتے ہو، لہلہاتے کھیت اور جھومتے درختوں کا نظارہ کرتے ہو، ٹھنڈی اور خوشگوار ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہو، ننھی کلیوں اور بہاروں بھرے گلوں سے مشام جان معطر کرتے ہو، لچکتی شاخوں پر طیورِ چمنستانی کی دل آویز صداؤں سے سرشار ہوتے ہو، آسمان پر ستاروں کی مجلسِ شبینہ اور چاندنی کی حسن افروزیوں سے شاد کام ہوتے ہو، یہ اس لیے نہیں کہ مَن کی دنیا پر کیف طاری کرنے والی یہ دلکش کائنات اپنی ذات میں حسین ہے بلکہ تم یہ سب کچھ اسی لیے کرتے ہو کہ اس سے خود تمہارا دل و دماغ اور تن من شاد کام ہوتے ہیں، جہاں کی یہ ساری رونقیں تمہارے دل و جان کی ایک رونق کو باقی رکھنے کے لیے ہیں اور ایک دل کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لیے تم اس حسین کائنات کی بزمِ دلکشی میں شریک ہوتے ہو، مادی فلسفۂ حیات کی یہ وہ تعبیر ہے جس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن مردِ مؤمن کا فلسفہ حیات، اس کی زندگی کا مقصد اور اس کے وجود کا ہدف

ونصب العین مادی فلسفہ کے اس تصور سے بلند اور بہت بلند ہے، اسے اپنی حیات کے بلند مقصد کے حصول کے لیے زندگی کا نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت ہو تو اپنی اس سب سے عزیز متاع کی قربانی کو وہ اپنے لیے سعادت خیال کرتا ہے، اسے ایک کیا، کئی زندگیاں عطا ہوں تو اس راہ میں وہ ان سب کے قربان کر دینے کو اپنے لیے خوش بختی تصور کرے گا، اس کے نزدیک کبھی جان اور کبھی تسلیمِ جان ہے زندگی، صدیوں پہلے زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ادا شدہ بلیغ الفاظ "ثم أحيى ثم أقتل، ثم أحيى ثم أقتل ثم أحيى ثم أقتل" مؤمن کے اسی عزمِ بلند پر شاہد عدل ہیں، اس گمان آباد ہستی میں یقین وایمان کی یہی وہ طاقت ہے جو مردِ مسلمان کو چٹانوں سے ٹکرا دیتی ہے، طوفانوں سے لڑا دیتی ہے، آندھیوں سے بھڑا دیتی ہے اور سمتِ ہوا کے ساتھ چلنے کی بجائے اس کا رخ موڑ دیتی ہے اور وہ جو کسی نے کہا ہے ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوب مؤمن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یا

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

یہ صرف جذباتی یا خوبصورت لفظوں کا سحر و طلسم نہیں اور نہ ہی شاعرانہ تخیل کی ایسی تعبیر ہے جس کی کوئی حقیقت باہر کی دنیا میں نہ پائی جاتی ہو بلکہ اسلامی تاریخ کا صفحہ صفحہ اس حقیقت کی صداقت پر گواہ اور اس کا سینہ سینہ شہیدانِ وفا کے لہو سے گلرنگ ولالہ زار ہے، یہاں اس عیاں حقیقت کے ثبوت کے لیے تاریخ سے مثالیں پیش کرنا مقصود نہیں۔

زندگی اور جان کے بعد انسان کے لیے عموماً مال اور شہرت کی محبت وہ شمع ہے جس پر مادی فلسفہ کا مارِ گزیدہ انسان، پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ پڑتا ہے، اس کے لیے وہ اپنے ابنائے جنس کو تہہ تیغ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا، شقاوتوں اور بے مہریوں کا مجسمہ بن کر وہ بستیاں اجاڑ دیتا ہے، آبادیوں کو ویران کر دیتا ہے، شہروں کے شہر کھنڈرات میں بدل دیتا ہے اور یہ ہوس جب بدبختی کی انتہائی حد تک اس کو اندھا بنا دیتی ہے تو وہ اپنے ہمدرد دوست، مخلص ساتھی، رحیم باپ اور شفیق ماں کے فنا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا، تاریخ عالم میں

لا تعداد واقعات ایسے ہیں کہ مال وجاہ کی خاطر ایک شقی القلب اٹھا، دوست کو قتل کیا، بھائی کو ہلاک کیا، باپ کو فنا کیا اور شفیق ماں کی زندگی کا چراغ گل کیا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ مال چاہتا ہے اور دوست اس کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہے، اس لیے کہ وہ عہدہ و منصب کا خواہش مند ہے اور باپ کی موجودگی میں وہ اسے مل نہیں سکتا، اس لیے کہ اس کا ایمان مادہ پر ہے اور مادی فلسفہ کے غلام کی نگاہ اپنی ذات کے دائروں سے آگے نہیں جاتی، اس لیے کہ اسے اس زندگی کے بعد کسی اگلی زندگی کا یقین نہیں، اس کا عقیدہ ہے کہ ”عالم دوبارہ نیست“، جو کچھ ہے یہی ہے اور اس فانی دنیا کا پجاری ہر اس چیز کے ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو اس کے مفاد سے ٹکراتی ہو.......... مادی فلسفۂ حیات کے اس روگ کو صوفیائے اسلام کی اصطلاح میں ”حب مال“ اور ”حب جاہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن ایک حقیقی مردِ مؤمن کی زندگی اس مرض کی کثافتوں سے بالکل شفاف اور پاک ہوتی ہے، یہاں تاریخ اسلام کے عہدِ زریں سے ایمانی زندگی کے اسی پہلو کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

یہ سن سولہ ہجری ہے، مسلمانوں نے مدائن فتح کیا، غنائم کا مال اکٹھا کیا گیا، اتنے میں ایک نقاب پوش مجاہد نے جواہرات سے بھری ہوئی تھیلی لا کر مال غنیمت میں جمع کرائی، سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس قدر قیمتی جواہرات اور اس غریب سپاہی کی نیت خراب نہ ہوئی، پوچھا گیا ”آپ نے اس سے کچھ لیا ہے؟“ فرمانے لگے ”اگر خوفِ خدا نہ ہوتا تو میں یہ قیمتی تھیلی آپ کے پاس لاتا بھی نہیں“ پوچھا ”آپ کا تعارف؟“ فرمایا ”میں اپنا تعارف نہیں کراتا کہ کہیں آپ لوگ میری تعریف و مدح نہ شروع کریں، تعریف کا مستحق اللہ جل شانہ ہے اور وہی مجھے میرے اس عمل کا بہترین صلہ دے سکتا ہے“ یہ کہہ کر چل دیا، بعض مجاہدین نے اس کا ٹھکانے تک پیچھا کیا، وہاں کے مجاہدین سے پوچھا تو انھوں نے کہا ”یہ عامر بن عبد ہیں“ عامر بن عبد جلیل القدر اور مشہور تابعی ہیں، جو زاہدِ شب زندہ دار بھی تھے اور محاذِ جنگ کے مجاہد و غازی صف شکن بھی!

(تاریخ طبری: ج:۴، ص:۱۸۶۔)

فتح مدائن کے اسی معرکہ میں ایک اور نقاب پوش سپاہی کے ہاتھ قیمتی جواہرات سے مرصع کسریٰ کا تاجِ زریں آیا تو وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیرِ افواجِ اسلامی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لاکر عرض کرنے لگا" أیها الأمیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے، مسلمان امیر، دریائے حیرت میں ڈوب گئے، پوچھا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کی طرف منہ کر کے اور امیر کی طرف پیٹھ کر کے کہا" جس کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے، وہ میرا نام جانتا ہے" یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

جب اموی سردار مسلمہ بن عبدالملک کو ایک قلعہ کا محاصرہ کئے کافی عرصہ گذر گیا اور کامیابی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو اس نے قلعہ پر دھاوا بولنے کے لیے چند جان بازوں کا انتخاب کیا، پھر لوگوں نے دیکھا کہ ایک جوان تیروں کی بارش اور دشمن کی صفوں سے آگ کے برستے شعلوں میں جان ہتھیلی پر رکھے دیوانہ وار قلعہ کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے اور بالآخر قلعے کی دیوار کے پاس پہنچ کر نقب لگانے میں کامیاب ہو گیا، اسلامی لشکر قلعہ میں داخل ہوا اور قلعہ فتح ہو گیا، اب ہر نگاہ اس سرفروش مجاہد کو تلاش کر رہی تھی جس کے سر اس فتح وکامرانی کا سہرا تھا، مگر کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ مسلمہ کے سوال پر سب نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے پورے لشکر کو جمع کیا اور کہا، "نقب لگانے والا جانباز کہاں ہے؟"...... پورے لشکر پر سناٹا طاری ہو گیا لیکن کوئی نہ آیا، مسلمہ بن عبدالملک نے دوبارہ کہا، "میں اس کو اس کے رب کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ سامنے آجائے"...... اچانک ایک نقاب پوش آگے بڑھا جس کی صرف آنکھیں ظاہر تھیں، مسلمہ کے سامنے آکر کھڑا ہوا اور کہا:

> "میں ہوں نقب لگانے والا، اگر آپ مجھے میرے رب کی قسم نہ دیتے تو میں کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا، اب میں بھی آپ کو آپ کے رب کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھ سے میرے نام کے بارے میں سوال نہ کرنا اور اگر آپ جان بھی لیں تو کسی سے ذکر نہ کرنا اس لیے کہ میں نے یہ عمل اس ذات کے لیے کیا ہے جو مجھے آپ سے زیادہ عطاء کرنے پر قادر ہے"۔

مسلمہ بعد میں جب دعا کرتے تو کہتے،اللھم اجعلنی مع صاحب النقب ”اے اللہ! مجھے نقب والے مجاہد کے ساتھ کر دیجئے“

(عیون الأخبار، ج:۱ : ص:۱۷۲‘)

قتیبہ بن مسلم کے لشکر میں ابن وال نامی ایک شخص غنائم کی جمع و تقسیم کی خدمت پر مامور تھا۔ ایک مرتبہ لشکر کے امراء میں سے کسی امیر نے اس سے کہا کہ میں اپنا ایک قاصد آپ کی خدمت میں بھیجوں گا تاکہ وہ غنائم میں سے میری جماعت کا حصہ وصول کر سکے، ابن وال قاصد کے انتظار میں رہا مگر وہ نہ پہنچا، اسی دوران ایک سپاہی وہاں سے گذرا تو ابن وال نے قاصد سمجھ کر اسے بلایا اور دراھم کی تھیلی سپرد کر کے کہا ”یہ لے جاؤ“ دوسرے دن امیر آیا، اس نے اپنی جماعت کا حصہ طلب کیا تو ابن وال نے کہا ”وہ تو میں آپ کے قاصد کے حوالے کر چکا ہوں“ امیر نے کہا، ”میں نے تو کسی کو نہیں بھیجا“ دونوں میں اختلاف ہو گیا۔ سپاہی کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ دراہم کی تھیلی لے کر حاضر ہوا جو بدستور پہلی حالت میں تھی اور اس میں پانچ لاکھ درہم تھے۔

(مقدمات الشیخ علی الطنطاوی ص:۱٦۵)

ابو عمرو بن نجید چوتھی صدی ہجری کے مشہور بزرگوں میں سے ہیں، ایک مرتبہ سرحدات کی حفاظت کے لیے رقم ختم ہو گئی، امیرِ شہر نے اہل خیر حضرات کو ترغیب دی اور سرِ مجلس رو پڑے، ابو عمرو بن نجید نے دولاکھ درہم کی خطیر رقم رات کے وقت آکر انھیں دیدی، امیر نے اگلے دن لوگوں کو جمع کیا، تعاون کرنے والے ابو عمرو کی تعریف کی اور کہا کہ انھوں نے مسلمانوں کی بروقت بڑی امداد کی، لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ابو عمرو اسی مجلس میں کھڑے ہو کر فرمانے لگے ”وہ رقم میری والدہ کی تھی، میں نے دیتے وقت ان سے پوچھا نہیں تھا، جب کہ وہ راضی نہیں ہیں، لہذا یہ رقم واپس کر دی جائے“ امیر نے واپس کر دی، اگلی رات ابو عمرو دوبارہ وہ رقم لے کر حاضر ہوئے اور کہا کہ ”یہ رقم لے لیں لیکن اس شرط

پر کہ آپ کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ کس نے دی ہے" امیر کی آنکھیں اشکبار ہوئیں، کہا" ابو عمرو! تم اخلاص کی کس قدر بلندی پر ہو،،

(طبقات کبری للسبکی، ج:۳، ص:۲۲۳۔)

" عموریہ " روم کا سب سے مضبوط اور ناقابلِ تسخیر شہر تھا، مشہور عباسی خلیفہ "معتصم باللہ" نے اسے فتح کیا تھا، اس کے فتح کرنے کا بھی عجیب سبب ہوا، ابن اثیر نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "الکامل" میں لکھا ہے کہ "معتصم" اپنے دربار میں حسب معمول تخت پر بیٹھا تھا، اسے آکر کسی نے یہ خبر دی کہ "عموریہ میں ایک مسلمان ہاشمی عورت رومیوں کی قید میں ہے اور وہ چیخ چیخ کر اپنے مسلمان خلیفہ کو "وامعتصماہ!" "وامعتصماہ!" کہہ کر پکارتی رہتی ہے"۔

معتصم نے جیسے ہی یہ خبر سنی، "لبیک لبیک" کہتے ہوئے اٹھا، اسی وقت نفیرِ عام کا اعلان کیا، وصیت لکھی، لشکر جمع کیا، پوچھا "رومیوں کا سب سے مضبوط شہر کون سا ہے؟" کہا گیا " عموریہ، رومیوں کا ایک ناقابلِ تسخیر شہر ہے، مسلمان آج تک اس کی طرف نہیں بڑھے، رومیوں کے نزدیک عموریہ، قسطنطنیہ سے بھی زیادہ عزیز ہے"۔

معتصم لشکر لے کر خود عموریہ کی طرف بڑھا اور ۵۵ دن کے محاصرہ کے بعد اسے فتح کیا۔

(الکامل لابن أثیر، ج:۵، ص:۲٤۷)

عموریہ کے محاصرہ کے دوران ایک شخص دیوار پر کھڑا ہو کر......العیاذ باللہ......نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا تھا، مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر تکلیف کی بات اور کیا ہو سکتی تھی، ہر مجاہد کی خواہش تھی کہ اس منحوس کے ہلاک کرنے کی سعادت اس کے حصے میں آئے لیکن وہ تیروں اور حملوں کی زد سے محفوظ ایسی جگہ کھڑا ہوتا جہاں سے اس کی آواز تو سنائی دیتی تھی لیکن اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی،

یعقوب بن جعفر نامی ایک شخص لشکرِ اسلام میں ایک بہترین تیر انداز تھا، اس ملعون نے جب ایک بار دیوار پر چڑھ کر شانِ رسالت میں گستاخی کے لیے منہ کھولا، یعقوب گھات میں تھا، تیر پھینکا جو سیدھا جاکر اس کے سینے سے پار ہوا، وہ گر کر ہلاک ہوا تو فضا نعرہ ہائے تکبیر سے گونج اٹھی، یہ مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کا واقعہ تھا، معتصم نے اس تیر انداز مجاہد کو بلایا اور کہا "آپ اپنے اس تیر کا ثواب مجھے فروخت کر دیجئے" مجاہد نے کہا "ثواب بیچا نہیں جاتا، کہا "میں آپ کو ترغیب دیتا ہوں" اور ایک لاکھ درہم اسے دیئے، مجاہد نے انکار کیا، خلیفہ نے پانچ لاکھ درہم اسے دیئے، تب وہ جانباز مجاہد کہنے لگا:

> "مجھے ساری دنیا دیدی جائے تو بھی اس کے عوض اس تیر کا ثواب فروخت نہیں کروں گا البتہ اس کا آدھا ثواب بغیر کسی عوض کے میں آپ کو ہبہ کر دیتا ہوں"۔

معتصم اس قدر خوش ہوا گویا اسے ایک جہاں مل گیا ہو، معتصم نے پھر پوچھا "آپ نے تیر اندازی کہاں سیکھی ہے؟ فرمایا: "بصرہ میں واقع اپنے گھر میں" معتصم نے کہا: "وہ گھر مجھے فروخت کر دیں" کہنے لگا "وہ رمی اور تیر اندازی سیکھنے والے مجاہدین کے لیے وقف ہے (اس لیے اسے فروخت نہیں کیا جا سکتا) معتصم نے اس جانباز مجاہد کو ایک لاکھ درہم انعام میں دیئے۔

(تعليقات رسالة المستر شدين للشيخ عبدالفتاح أبي غدة، ص:۲۳۹)

اخلاص وللّٰہیت کے پیکر اور دنیا کے ظلمت کدوں میں ایمانی زندگی کی شمع روشن کرنے والے سربکف مجاہدین کا یہ وہ قافلہ تھا جس نے انسانیت کے سامنے اسلامی تعلیمات کی ابدی صداقتوں کی راہ میں رکاوٹ بننے والے خاشاکِ غیر اللہ کو ہٹانے کے لیے اسلام کی بلند قدروں کی صحیح تصویر پیش کی، نتیجتاً امن و آشتی اور عدل وانصاف کا حامل دینِ اسلام، ابرِ رحمت بن کر پورے عالم پر چھا گیا اور اس کے برکات وثمرات سے کائنات کا ذرہ ذرہ روشن ومنور ہوا۔

آج مسلمانوں کے لٹے پٹے کاروان کو ابو عمرو بن نجید اور یعقوب بن جعفر جیسے جانباز مخلصین کی کس قدر حاجت ہے، ایک مسلمان خاتون کی پکار پر لبیک کہنے والے معتصم جیسے خلیفہ کی آج عالم اسلام کو کتنی ضرورت ہے، بوسنیا، فلسطین، برما، کشمیر، چیچنیا...... اور جانے دنیا کے کتنے خطے ہیں اور روئے زمین کے نقشے پر عہد جدید کے کتنے عمورئیے ہیں جہاں کی فضاؤں میں اسلامی تہذیب کے نشیمن کے ایک ایک تنکے پر بجلیاں گرائی جاتی ہیں، جہاں کے خلاؤں میں مسلمانوں کے خاکستر کو صرف اس لیے بکھیرا جاتا ہے کہ کہیں اس میں چنگاریاں پوشیدہ نہ ہوں، جہاں مسلمان ماؤں، بہنوں کی دردناک صدائیں بلند ہو رہی ہیں، جہاں کے سناٹوں میں ان کی المناک فریادیں گونج رہی ہیں، جہاں کی وسعتوں میں ان کی عصمتوں کی چادر تار تار تیر رہی ہے، جہاں جہاں جہاں...... لیکن آہ! آج کوئی معتصم نہیں جو نفیرِ عام کا اعلان کرے، جو ان کی اشک شوئی کرے، جو ان صداؤں پر "لبیک لبیک" کہتے ہوئے بے چین ہو جائے، جو بیتے دنوں کو لوٹا دے، گذری تاریخ کو دہرا دے۔

ہاں دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

☆☆☆☆☆

چراغِ محبت

سیرت کا کون سا گوشہ ہے جس پر نہیں لکھا گیا، کون سا پہلو ہے جس پر نہیں کہا گیا، کون سی زبان ہے جو مدحِ نبی سے آراستہ نہ ہوئی ہو، یقیناً کوئی گوشہ، کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر خامہ فرسائی نہ کی گئی ہو، تعبیرات کے شہ پارے، خطابت کے شاہکار، منظوم جواہر پارے لے کر ادیب و خطیب و شاعر دربارِ رسالت میں حاضری اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں، عبادت سمجھتے ہیں، انداز سب کا عاشقانہ، ہر ایک کا والہانہ، اس لیے نہیں کہ سیرتِ سرور دوعالم ﷺ کو اس کی حاجت ہے کہ جمالِ سیرت تو ان سب سے مستغنی و بے نیاز...... تاہم لفظوں کے جس صدف کو ابرِ سیرت چھو گیا، وہ گوہر میں ڈھل گیا...... ولکن مدحت مقالتی بمحمد...... کیا کوئی زبان ایسی ہے جہاں ادب کی فضائیں حضورِ رسالت میں نہ سلام کہتی ہوں، نہ پیام دیتی ہوں...... نہیں اور قطعاً نہیں، اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کی سیرت کا ایک پہلو ہے محبوبیت و عقیدت کا، دلوں میں آپ کے احترام و عظمت کا، شاہ ہو کہ گدا، فقیر ہو کہ امیر، عاصی ہو کہ پاکباز، بندۂ مؤمن کے دل میں آپ ﷺ کی محبت کا چراغ روشن رہتا ہے، یہ چراغ...... چراغِ محبت سرمایۂ ملت بھی ہے اور سرمایۂ ملت کا نگہبان بھی، گناہوں سے آلودہ، معاصی کا خوگر، لاابالی و آوارہ، ہر سو غفلت کے چھائے ہوئے اندھیاروں میں گھرا ایک امتیٔ ختم الرسل کے سامنے جب نام "محمد ﷺ" کا آجائے تو اس کی آنکھوں میں عقیدت کا نور، محبت کا سرور جھلکنے لگتا ہے، چھلکنے لگتا ہے۔ دو مثالیں

پڑھئے ایک شاہ و حکمران کی دوسری ایک شاعرِ خراباتی کی، شرابی و کبابی کی:

(۱) بادشاہ ناصر الدین محمود کے ایک خاص مصاحب کا نام "محمد" تھا، بادشاہ اسے اسی نام سے پکارا کرتا تھا، ایک دن انہوں نے خلاف معمول اسے "تاج الدین" کہہ کر آواز دی وہ تعمیل حکم میں حاضر تو ہو گیا لیکن بعد میں گھر جا کر تین دن تک نہیں آیا، بادشاہ نے بلاوا بھیجا، تین روز تک غائب رہنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا "آپ ہمیشہ مجھے "محمد" کے نام سے پکارا کرتے ہیں لیکن اس دن آپ نے "تاج الدین" کہہ کر پکارا، میں سمجھا کہ آپ کے دل میں مرے متعلق کوئی خلش پیدا ہو گئی ہے، اس لیے تین دن حاضر خدمت نہیں ہوا، ناصر الدین نے کہا "واللہ! میرے دل میں آپ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خلش نہیں" تاج الدین" کے نام سے تو میں نے اس لیے اس دن پکارا تھا کہ اس وقت میرا وضو نہیں تھا اور مجھے "محمد" کا مقدس نام بغیر وضو کے لینا مناسب معلوم نہیں ہوا۔"

(تاریخ فرشتہ :ج:ا:ص۲۷۶)

(۲) اختر شیرانی اردو کے مشہور شاعر گذرے ہیں، لاہور کے عرب ہوٹل میں ایک دفعہ کمیونسٹ نوجوانوں نے جو بلا کے ذہین تھے اختر شیرانی سے مختلف موضوعات پر بحث چھیڑ دی۔ اس وقت تک وہ دو بوتلیں چڑھا چکے تھے اور ہوش قائم نہ تھے، تمام بدن پر رعشہ طاری تھا۔ حتی کہ الفاظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر زبان سے نکل رہے تھے، ادھر "انا" کا شروع سے یہ حال تھا کہ اپنے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے، جانے کیا سوال زیر بحث تھا، فرمایا...... "مسلمانوں میں تین شخص اب تک ایسے پیدا ہوئے جو ہر اعتبار سے جینیس بھی ہیں اور کامل الفن بھی، پہلے ابو الفضل، دوسرے اسد اللہ خان غالب، تیسرے ابو الکلام آزاد......" شاعر وہ شاذ ہی کسی کو مانتے تھے، ہمعصر شعراء میں جو واقعی شاعر تھا، اسے بھی اپنے سے کمتر خیال کرتے تھے، کمیونسٹ نوجوانوں نے "فیض" کے بارے میں سوال کیا، طرح دے گئے، "جوش" کے متعلق پوچھا کہا، وہ ناظم ہے، "سردار جعفری" کا نام لیا، مسکرائے، "فراق" کا ذکر چھیڑا "ہوں ہاں" کر کے چپ ہو گئے، "ساحر لدھیانوی" کی بات کی، سامنے بیٹھا تھا،

فرمایا، مشق کرنے دو، ’’ظہیر کاشمیری‘‘ کے بارے میں کہا، نام سنا ہے، احمد ندیم قاسمی؟ فرمایا ’’میرا شاگرد ہے......‘‘ نوجوانوں نے دیکھا کہ ترقی پسند تحریک ہی کے منکر ہیں تو بحث کا رُخ پھیر دیا، ’’حضرت! فلاں پیغمبر کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں، نشہ میں چور تھے، زبان پر قابو نہیں تھا، لیکن چونک کر فرمایا...... ’’کیا بکتے ہو؟ ادب و انشاء یا شعر و شاعری کی بات کرو‘‘ کسی نے فوراً ہی افلاطون کی طرف رُخ موڑ دیا، ان کے مکالمات کی بابت کیا خیال ہے؟ ارسطو اور سقراط کے بارے میں سوال کیا، مگر اس وقت وہ اپنے موڈ میں تھے، فرمایا...... ’’اجی، پوچھو یہ کہ ہم کون ہیں، یہ ارسطو، افلاطون یا سقراط آج ہوتے تو ہمارے حلقے میں بیٹھتے، ہمیں ان سے کیا کہ ان کے بارے میں رائے دیتے پھریں‘‘...... اس لڑکھڑائی ہوئی آواز سے فائدہ اُٹھا کر ایک ظالم قسم کے کمیونسٹ نے سوال کیا، ’’آپ کا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘...... اللہ اللہ، ایک شرابی جیسے کوئی برق تڑپی ہو، بلّور کا گلاس اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا...... ’’بدبخت! ایک عاصی سے سوال کرتا ہے، ایک سیہ رو سے پوچھتا ہے! ایک فاسق سے کیا کہلوانا چاہتا ہے؟‘‘...... تمام جسم کانپ رہا تھا، ایکا ایکی رونا شروع کیا، گھگھی بندھ گئی...... ’’ایسی حالت میں تم نے یہ نام کیوں لیا، تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ گستاخ! بے ادب ’’باخدا دیوانہ باش، و با محمدؐ ہوشیار‘‘ اس شریر سوال پر توبہ کرو، تمہارا خبثِ باطن سمجھتا ہوں‘‘...... خود قہر و غضب کی تصویر ہو گئے، اس نوجوان کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، اس نے بات کو موڑنا چاہا، مگر اختر کہاں سنتے تھے، اسے اٹھوا دیا، پھر خود اُٹھ کر چلے گئے، تمام رات روتے رہے، کہتے تھے...... ’’یہ لوگ اتنے نڈر ہو گئے ہیں کہ آخری سہارا بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں، میں گنہگار ضرور ہوں لیکن یہ مجھے کافر بنا دینا چاہتے ہیں‘‘[۱]

(مجھے ہے حکم اذاں: ص ۱۷، ۱۸)

دیکھا آپ نے ایک گنہگار امتیٔ ختم الرسل کا عشقِ والہانہ، عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں ڈوبی ہوئی اختر شیرانی کی یہ نعت بھی پڑھیے:

اگر اے نسیمِ سحر ترا گذر ہو دیارِ حجاز میں
مری چشمِ تر کا سلام کہنا حضور بندہ نواز میں

تمہیں حدِّ عقل نہ پاسکی فقط حال اتنا بتاسکی
کہ تم ایک جلوۂ راز تھے جو عیاں ہے رنگِ مجاز میں

نہ جہاں میں راحتِ جاں ملی نہ متاعِ امن و اماں ملی
جو دوائے دردِ نہاں ملی تو ملی بہشتِ حجاز میں

عجب اک سرور سا چھا گیا، میری روح و دل میں سما گیا
تیرا نام سے آگیا مرے لب پہ جب بھی نماز میں

کروں نذر نغمۂ جانفزا میں کہاں سے اختر بے نوا
کہ سوائے نالۂ دل نہیں ہے مرے دل کے غمزدہ ساز میں

☆☆☆☆☆

صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا

بقول مولانا سید سلیمان ندوی دنیا کے غربت کدے میں اسلام کی آواز بے کسی کے عالم میں بلند ہوئی اور اجنبیت کے کانوں سے سنی گئی، یہ آواز پر کشش تھی اور اس میں شاہراہِ حیات کے تھکے مسافروں کے لیے زندگی کی راہِ تاباں کا پیغام تھا، جن سعادت مندوں نے کانوں سے عناد کی ڈاٹ ہٹائی......اس آواز کی اجنبیت دور اور اس کی بیگانگی کافور ہو کر ان کے دلوں میں اترتی چلی گئی، اسلام کا قافلہ بڑھتا اور اس کا آفتاب چڑھتا گیا، تاہم جس مبارک سرزمین میں یہ آواز بلند ہوئی تھی، وہاں بیگانوں کا ابھی قبضہ تھا، اسلام کے کارواں میں شامل ہونے والے ابھی بے کسی کے عالم میں تھے، ان میں وہ بھی تھے جنھوں نے ظلم سہہ سہہ کر شہادت پائی، وہ بھی تھے جنہیں دربدر کردیا گیا، وہ بھی تھے جنہیں شعلے برساتے آسماں کی گرمی وتپش میں، آگ اگلتی ریت پر لٹادیا جاتا، لیکن ظلم کا کوئی حربہ اور طاقت کی کوئی قسم اسلام کی محبت ان کے دل سے کھرچ نہ سکی، منہ کے بل گرگر کران کی زبان سے " هو الله أحد "کا نغمۂ توحید ہی بلند ہوتا۔

حجاز کی زمین جب ان پر تنگ کردی گئی، اپنے بیگانے اور عمر بھر کے رفیق، دشمنی وعداوت میں دیوانے بن گئے تو اس مبارک کارواں کا ایک قافلہ حبشہ کی طرف روانہ ہوا، اپنے وطن کی مٹی سے انسان کا پیار فطری ہوتا ہے کہ اس سے بچپن کی یادیں، لڑکپن کی شوخیاں اور جوانی کی رعنائیاں وابستہ ہوتی ہیں، اسے چھوڑ کر کہیں اور جابسنا کسی غیر معمولی جذبہ ہی کا کرشمہ ہوسکتا ہے، اس لیے حبشہ کے بادشاہ نے جن کا نام حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابة" میں "اصحمه" لکھا ہے، اس قافلۂ اسلام کو بلایا، ہجرت کی وجہ دریافت کی تو

مشہور صحابی حضرت جعفر طیارؓ کھڑے ہوئے، تقریر کی، حضرت جعفر نے اس تقریر میں عصرِ جاہلیت کا نقشہ اور اسلامی قدروں کی تصویر کشی اس خوبی سے کی ہے کہ یہ تقریر جامعیتِ بیان کا ایک حسین شہ پارہ، ادبِ عربی کا خوبصورت گلدستہ اور تاریخِ اسلامیات کی ایک قیمتی دستاویز بن گئی ہے، اس کا اصل لطف تو عربی ہی میں ہے لیکن اردو میں اس کے ابتدائی حصہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہے، حضرت جعفرؓ نے فرمایا:

"أيها الملك! ہم جاہل تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بے حیائی کا ارتکاب کرتے تھے، قرابتوں کو قطع کرتے تھے، پڑوسیوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے، قوی ضعیف کو کھا جاتا تھا، ہم جاہلیت کی اسی وحشت کا شکار تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا، ایسا پیغمبر کہ جس کا حسب اور جس کا نسب، جس کا صدق اور جس کی دیانت، جس کی امانت اور جس کی عفت، سب سے ہم خوب واقف ہیں، اس نے ہمیں توحید ربانی اور عبادت الٰہی کی دعوت دی، ہم اور ہمارے آباء واجداد جن بے جان پتھروں اور بتوں کی پرستش کرتے تھے ان سب کو یکلخت چھوڑ دینے کی ہدایت کی، بات کی سچائی اور امانت کی ادائیگی، اپنوں کے ساتھ صلہ رحمی اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، حرام کاموں سے رکنے اور فساد وخونریزی سے بچنے کی تاکید کی اور ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، صرف اسی کی عبادت کریں اور نماز پڑھیں، زکوٰۃ دیں اور روزہ رکھیں۔ چنانچہ ہم نے ان کی تصدیق کی، ان پر ایمان لائے اور اللہ کی جناب سے وہ جو کچھ لے کر آئے اس کی پیروی کی، سو اب ہم صرف اللہ کی عبادت کرتے ہیں، شرک سے بچتے ہیں، حلال ہی کو حلال سمجھتے ہیں اور حرام سے رکتے ہیں، جس کی وجہ سے ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی، اس نے ہمیں تکلیفیں دیں اور

ہمیں اپنے دین کے متعلق طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈالا، وہ چاہتی ہے کہ ہم پھر سے بے جان بتوں کی عبادت شروع کر دیں، پھر خبائث کو حلال سمجھنے لگیں اور ایک بار پھر ان رسومات میں مبتلا ہو جائیں..........جب اس نے ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے، زمین ہم پر تنگ کر دی اور ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان حائل ہونے لگی تو ہم آپ کے دیار کی طرف نکل آئے، آپ کی ہمسائیگی میں رغبت کی اور سب کو چھوڑ کر نگاہِ پسند آپ پر ٹھہرائی۔"

یہ حق کی نوا تھی جو دل سے نکلی تھی اور دل پر جا لگی تھی، نجاشی کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں، اس کی شاہانہ نظریں اسلام کی روشنی دیکھ چکی تھیں، اس کا دل اسلام کی حقانیت کا گواہ بن چکا تھا اور اس کی زبان "أشهدأن لا إله الا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله" کہہ کر اپنے لیے سعادت ابدی کا اعلان کر چکی تھی۔

(سیرت ابن ہشام ج۱، ص ۳۳۴۔۳۴۱)

امن و آشتی کا پیغام سنانے والا اسلام کا مسافر آج پھر تنہا ہے، چاروں طرف اس کو بیگانگی، اجنبیت اور مسافرانہ بے کسی نظر آرہی ہے، بتانا یہ ہے کہ یہ بیگانگی، کاروانِ اسلام کے لیے باعثِ خلش نہیں ہونی چاہئے کہ مبارک قرار دیئے گئے ہیں ایسے بیگانے، آج سے صدیوں پہلے زبانِ نبوت سے اس کی پیش گوئی ہو چکی ہے، ارشاد ہوا:

بدأ الإسلام غريباً، وسيعود كما بدأ فطوبى للغرباء۔

"اسلام کا آغاز مسافرانہ بے کسی میں ہوا اور پھر وہ مسافرانہ بے کسی میں ہوگا پس مسافرت کے بے کسوں کو مبارکباد ہو"۔

(صحیح مسلم ج۱، ص ۸۴، کتاب الایمان)

حقیقت یہ ہے کہ مسافرِ اسلام کو اجنبی سمجھنے والے خود مظلوم اور قابل رحم ہیں کہ یہ دنیا اپنی زندگی کے ان گنت سال گزار چکی ہے اور خدا جانے اس کی عمر کتنی باقی ہے لیکن جب تک دنیا اسلام کے قدموں میں گر گر کر اپنے درد کا درماں تلاش نہیں کرے گی، اس وقت تک دکھوں، محرومیوں، لپکتے ہوئے شعلوں اور سلگتے ہوئے داغوں کے سوا اس کے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا،......کچھ نہیں آئے گا۔

☆☆☆☆☆☆

ہم نے کانٹوں میں بھی گلزار کھلا رکھا ہے

عبداللہ بن محمد جہادی مہم کے سلسلے میں، مصر کے ایک ساحلی علاقے میں مقیم تھا، ٹہلتا ہوا ایک بار ساحل سمندر جا نکلا، وہاں دیکھا کہ خیمہ میں ہاتھ پاؤں سے معذور اور آنکھوں کی بینائی سے محروم ایک شخص پڑا ہوا ہے، اس کے جسم میں صرف اس کی زبان سلامت ہے، ایک طرف اس کی یہ حالت ہے......اور دوسری طرف وہ بآواز بلند کہہ رہا ہے:

"میرے رب! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرما، مجھے تو نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر فضیلت اور فوقیت بخشی ہے، اس فوقیت پر مجھے اپنی حمد و ثناء کی توفیق عطا فرما"۔

عبداللہ نے یہ دعا سنی تو اسے بڑی حیرت ہوئی، ایک آدمی ہاتھ پاؤں سے معذور ہے، بینائی سے محروم ہے، جسم میں زندگی کی تازگی کا کوئی اثر نہیں اور وہ اللہ سے نعمتوں پر شکر کی دعا مانگ رہا ہے، اس کے پاس آکر سلام کیا اور پوچھا:

"حضرت! آپ اللہ تعالیٰ کی کس نعمت اور فوقیت پر شکر اور حمد و ثناء کی توفیق کے خواستگار ہیں"؟

معذور شخص نے جواب میں فرمایا اور خوب فرمایا:

"آپ کو کیا معلوم میرے رب کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے، بخدا، اگر وہ آسمان سے آگ برسا کر مجھے راکھ کر دے، پہاڑوں کو حکم دے کر مجھے کچل دے، سمندروں کو مجھے غرق کرنے کے لیے کہہ دے اور زمین کو مجھے نگلنے کا حکم دے تو میں کیا کر سکتا ہوں، میرے ناتواں جسم میں زبان کی بے بہا نعمت کو تو دیکھئے کہ یہ سالم ہے، کیا صرف اس ایک

زبان کی نعمت کا میں زندگی بھر شکر ادا کر سکتا ہوں"؟

پھر فرمانے لگے "میرا ایک چھوٹا بیٹا میری خدمت کرتا ہے، خود میں معذور ہوں، زندگی کی ضروریات اسی کے سہارے پوری ہوتی ہیں لیکن وہ تین دن سے غائب ہے، معلوم نہیں کہ کہاں ہے آپ اس کا پتہ کرلیں تو مہربانی ہوگی"۔

ایسے صابر وشاکر اور محتاج انسان کی خدمت سے بڑھ کر اور سعادت کیا ہو سکتی ہے، عبداللہ نے بیابان میں اس کی تلاش شروع کی تو یہ دردناک منظر دیکھا کہ مٹی کے دو تودوں کے درمیان ایک لڑکے کی لاش پڑی ہوئی ہے جسے جگہ جگہ سے درندوں اور پرندوں نے نوچ رکھا ہے، یہ اسی معذور شخص کے بیٹے کی لاش تھی، اس معصوم کی لاش اس طرح بے گور وکفن دیکھ کر عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس کے معذور والد کو اس المناک حادثہ کی اطلاع کیسے دے؟ ان کے پاس گئے اور ایک لمبی تمہید کے بعد انھیں اطلاع کر دی، بیٹے کی وحشتناک موت سے کون ہوگا جس کا جگر پارہ پارہ نہ ہو لیکن

جائز نہیں اندیشۂ جان، عشق میں اے دل!
ہشیار! کہ یہ مسلکِ تسلیم ورضا ہے

خبر سن کر معذور والد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے، دل پر غموں کے بادل چھا جائیں تو آنکھوں سے اشکوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کہ غم کا غبار اشکوں میں ڈھل کر نکل جاتا ہے، شکوہ وشکایت کی بجائے فرمانے لگے:

"حمد وستائش اس ذات کے لیے ہے جس نے میری اولاد کو اپنا نافرمان نہیں پیدا کیا اور اسے جہنم کا ایندھن بننے سے بچایا" پھر "اناللہ............" پڑھا اور ایک چیخ کے ساتھ سعید روح نے قفسِ عنصری سے گویا یہ کہتے ہوئی آزادی حاصل کرلی کہ:

اب اے خیال یار نہیں تاب ضبط کی
بس اے فروغِ برق تجلی کہ جل گئے
اب کیا ستائیں گی ہمیں دوراں کی گردشیں
ہم اب حدودِ سودوزیاں سے نکل گئے

ان کی اس طرح اچانک موت پر عبداللہ کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، کچھ لوگ اس طرف نکلے، رونے کی آواز سنی، خیمے میں داخل ہوئے، میت کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو اس سے لپٹ گئے، کوئی ہاتھ چومتا، کوئی آنکھوں کو بوسہ دیتا، ساتھ ساتھ کہے جاتے:

"ہم قربان ان آنکھوں پر جنہوں نے کبھی کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا، ہم فدا اس جسم پر جو لوگوں کے آرام کے وقت بھی اپنے مالک کے سامنے سجدہ ریز رہتا، جس نے اپنے رب کی کبھی نافرمانی نہیں کی......"

عبداللہ یہ صورت حال دیکھ کر حیران ہو رہا تھا، پوچھا "یہ کون ہیں، ان کا کیا تعارف ہے" کہنے لگے "آپ ان کو نہیں جانتے؟ یہ رسول اللہ ﷺ کے سچے عاشق اور حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد، مشہور محدث حضرت ابو قلابہ ہیں"۔

حدیث کا ادنی طالب علم بھی حضرت ابو قلابہؒ کے نام سے واقف ہے، صبر واستقامت کے پیکر اور تسلیم ورضا کے بلند مقام کے حامل حضرت ابو قلابہؒ کی تجہیز و تکفین اور نماز وتدفین سے فارغ ہونے کے بعد عبداللہ رات کو سویا تو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت کے باغات میں سیر وتفریح کر رہے ہیں، جنت کا لباس زیب تن ہے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے ہیں ﴿سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار﴾ (صبر کرنے کے سبب تم پر سلامتی ہو اور آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے) عبداللہ نے پوچھا "آپ وہی معذور شخص ہیں؟"...... فرمانے لگے:

"جی ہاں میں وہی شخص ہوں، اللہ جل شانہ کے ہاں چند بلند مراتب اور درجات ایسے ہیں جن تک رسائی مصیبت میں صبر، راحت میں شکر اور جلوت وخلوت میں خوفِ خدا کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی صبر وشکر کی بدولت مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے"۔

(کتاب الثقات لأبی حاتم ابن حبان، ج:۵، ص:۳۔)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کی گنتی نہیں کی جاسکتی، زندگی کی جس جہت میں دیکھیے، نعمتوں کے گلستان کے گلستان لہلہا رہے ہیں، انسانی زندگی اگرچہ غم اور حسرت کی دھوپ چھاؤں سے عبارت ہے لیکن در حقیقت وجودِ غم بھی احساسِ مسرت کے لیے ہے، الم کی چاشنی سے زندگی میں حسن بھی آتا ہے، اہل اللہ اور اہل وفا کو غم میں بھی راحت حاصل ہوتی ہے جبکہ اہلِ ہوس کی ساری زندگی راحت کے غم میں ختم ہو جاتی ہے، ناشکروں کا المیہ یہ ہے کہ ان کی نظر ہمیشہ زندگی کی تلخیوں پر رہتی ہے، زندگی کی ہزار نعمتوں اور رحمتوں کی چھاؤں میں انھیں کچھ تلخیوں کی تپش محسوس ہو تو اسی کا رونا رونے لگتے ہیں، ایسے لوگ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں، وہ ہر سو برسی ہوئی نعمتوں کی بہار میں بھی یہ کہتے ہیں کہ:

تمام غنچہ و گل داغِ دل بنے کیفی
خزاں نصیب بہاروں سے کیا لیا میں نے

لیکن ایک حقیقی مردِ مؤمن کی شان اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ مصائب راہِ منزل میں آتے اور حوادث راستے میں دام پھیلاتے ہی ہیں لیکن اس کی بنا پر نعمتوں سے اس کی نظر او جھل نہیں رہتی، ہزار راحتوں کے جلو میں چند ایک تکالیف کی چبھن کی وجہ سے وہ صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتا، غمِ حیات میں اس کا دستور یہی کہتا ہے کہ

دل کا ہر داغ تبسم میں چھپا رکھا ہے
ہم نے ہر غم کو غمِ یار بنا رکھا ہے
نوک ہر خار سے پوچھو وہ گواہی دیں گے
ہم نے کانٹوں میں بھی گلزار کھلا رکھا ہے
خود میرے دل نے تراشے ہیں غموں کے پیکر
میرے مولا نے تو ہر غم سے بچا رکھا ہے

☆☆☆

غم زیست کا حاصل ہے اس غم سے مفر کیوں ہو

مشہور تابعی حضرت عروہ بن زبیر مصائب و تکالیف پر بہت صبر کرنے والے تھے، صبر و استقامت کے پیکر تھے، ایک مرتبہ ولید بن یزید سے ملنے دمشق روانہ ہوئے تو راستے میں چوٹ لگ کر پاؤں زخمی ہو گیا، درد کی شدت سے چلنا دوبھر ہو گیا، سخت تکلیف کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور دمشق پہنچ گئے، ولید نے فوراً طبیبوں کو بلوا بھیجا، انہوں نے زخم کا بغور جائزہ لینے کے بعد پاؤں کاٹنے کی رائے پر اتفاق کیا، حضرت عروہ کو جب اس کی اطلاع کی گئی تو انہوں نے منظور کر لیا مگر پاؤں کاٹنے سے پہلے بے ہوشی کے لئے نشہ آور دوا کے استعمال سے یہ کہہ کر صاف انکار دیا کہ میں کوئی لمحہ اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں گزار سکتا۔ چنانچہ اسی حالت میں آرہ گرم کر کے ان کا پاؤں کاٹ دیا گیا اور انہوں نے کسی قسم کی تکلیف کا اظہار نہ کیا، پھر اپنا کٹا ہوا پاؤں سامنے رکھ کر فرمایا، "کیا غم ہے اگر مجھے ایک عضو کے بارے میں آزمائش میں ڈال کر باقی اعضاء کے سلسلے میں امتحان سے بچا لیا گیا ہے" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ انہیں خبر ملی "ان کا ایک بیٹا چھت سے گر کر انتقال کر گیا ہے" انہوں نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھی اور فرمایا "اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے ایک جان لی اور کئی جانوں کو سلامت رکھا" (کیونکہ باقی بیٹے سلامت تھے)۔

اس واقعہ کے بعد ولید کے پاس قبیلہ عبس کے کچھ لوگ آئے جن میں ایک بوڑھا اور آنکھوں سے اندھا شخص بھی تھا، ولید نے اس سے اس کا حال پوچھا اور اس کی بینائی کے ختم ہونے کا سبب دریافت کیا تو وہ بتانے لگا:

"میں اپنے اہل و عیال اور تمام مال و اسباب لئے ایک قافلے
کے ساتھ سفر میں نکلا، اہل قافلہ میں سے شاید ہی کسی کے پاس اتنا
مال ہو جتنا میرے پاس تھا، ہم نے ایک پہاڑ کے دامن میں رات
گزارنے کیلئے پڑاؤ ڈالا، آدھی رات کے وقت جب سب میٹھی نیند سو
رہے تھے خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اچانک سیلاب آ گیا جو انسان، حیوان، مال
و اسباب سب کچھ بہا لے گیا، میرے اہل و عیال اور مال و اسباب میں
سے سوائے ایک اونٹ اور میرے ایک چھوٹے بچے کے علاوہ کچھ نہ بچا
، میں ابھی اس ناگہانی آفت سے سنبھلنے بھی نہ پایا کہ میرا اونٹ بھاگ
گیا، میں اس کے پیچھے گیا تو یکدم بچے کے چیخنے چلانے نے قدموں کو
روک لیا، الٹے پاؤں واپس بچے کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک
بھیڑیئے نے میرے معصوم لخت جگر کو اپنے خونی جبڑوں میں دبوچا
ہوا ہے اور وہ معصوم اس کے بے رحم جبڑوں میں زندگی کی بازی ہار چکا
ہے، یہ دلخراش منظر دیکھنے کے بعد میں پھر اس اونٹ کے پیچھے ہو لیا
جب اس کے قریب پہنچا تو اس نے مجھے دولتی دے ماری جس کی وجہ
سے میری بینائی چلی گئی، اس طرح میں مال و عیال کے ساتھ ساتھ
آنکھوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا"۔

اس کی یہ داستان غم سن کر ولید کی آنکھیں پر نم ہو گئیں اور اس نے کہا، "جاؤ، عروہ ابن زبیر سے کہدو تمہیں صبر و شکر مبارک! اس لئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو تم سے زیادہ غموں اور مصیبتوں کے مارے ہیں"۔

میں دے کے غم جاناں کیوں عشرت دنیا لوں
غم زیست کا حاصل ہے، اس غم سے مفر کیوں ہو

(المستطرف ص:۳۳۹)

☆☆☆☆☆

کھلا دَر

احمد بن ابی غالب چھٹی صدی ہجری کے بزرگ ہیں، لوگ ان کے پاس دعا کے لیے عموماً حاضر ہوتے تھے، ایک مرتبہ کوئی صاحب ان کی خدمت میں آئے اور کسی چیز کے متعلق کہا کہ "آپ فلاں صاحب سے میرے لیے وہ چیز مانگ لیجئے" احمد فرمانے لگے "میرے بھائی! میرے ساتھ کھڑے ہو جایئے، دونوں دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ ہی سے کیوں نہ مانگ لیں، کھلا در چھوڑ کر بند دروازے کا رخ کیوں کیا جائے"۔

(ذیل طبقات الحنابلة ج:١ ص:٢٢٤)

یقیناً اللہ کا در ہر وقت کھلا ہے، یہ یقین اور ایمان کی کمزوری ہوتی ہے کہ اسے چھوڑ کر مخلوق کے بند دروازوں پر کھڑے ہو کر ذلت اٹھائی جائے، اس کھلے در کی طرف رجوع کی عادت توڈالیے، آزما کر تو دیکھئے۔

دلِ دشمناں سلامت، دلِ دوستاں نشانہ

سفیان بن حسین نامی ایک شخص قاضی ایاس بن معاویہ کی مجلس میں بیٹھ کر کسی آدمی کی غیبت کرنے لگا، قاضی نے اس سے کہا "آپ نے رومیوں کے ساتھ جہاد کیا؟" کہنے لگا "نہیں" پوچھا "سندھ اور ہند کے جہاد میں شریک ہوئے ہو؟" کہا "نہیں" فرمانے لگے "روم، سندھ اور ہند کے کفار تو آپ سے محفوظ رہے لیکن بے چارہ اپنا ایک مسلمان بھائی آپ

سے نہ بچ سکا اور زبان کی تلوار اس پر چلادی" سفیان پر ان کے اس جملے کا اس قدر اثر ہوا کہ زندگی بھر پھر کسی کی غیبت نہیں کی

(البداية والنهاية: ج۹، ص ۳۳٦، ترجمه اياس)

غیبت سے بچاؤ کا نسخہ

امام ابن وہب دوسری صدی ہجری کے مشہور محدث اور فقیہ ہیں، فرماتے ہیں، میں نے غیبت سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جس دن کسی کی غیبت کر دیتا، اگلے دن نفس کو سزا دینے کے لیے روزہ رکھ لیتا، لیکن بات بنی نہیں، روزہ رکھنا عادت سی بن گئی اور سزا کی تلخی کی بجائے اس میں لطف محسوس ہونے لگا، ظاہر ہے جو چیز پر لطف ہو، وہ سزا کیسے ہو سکتی ہے، اس لیے میں نے روزہ کی بجائے ہر غیبت کے عوض ایک درہم صدقہ کرنا شروع کیا، یہ سزا نفس کو شاق معلوم ہوئی اور یوں غیبت کے روگ سے نجات ملی۔

(ترتيب المدارك للقاضي عياض: ج۳، ص: ۲٤٠)

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

عبداللہ بن وہب کی موت کا بھی عجیب واقعہ ہے، اصحاب حدیث نے ان سے کہا کہ ہمیں جنت اور جہنم کے احوال سنا دیجئے، فرمایا "میں اس کی تاب نہیں لا سکتا" وہ سمجھے کہ شاید تواضعاً کہہ رہے ہیں، اصرار ہوا تو بیٹھ گئے، جہنم کے احوال کے متعلق احادیث شروع فرمائیں تو بے ہوش ہو گئے، لوگوں نے چہرے پر پانی کی چھینٹیں ڈالیں لیکن فرق نہیں پڑا، کسی نے کہا "احوال جنت کی احادیث انھیں سنا دیجئے" وہ بھی پڑھ کر سنائی گئیں لیکن ہوش میں نہیں آئے اور بے ہوشی کے عالم میں بارہ دن گذر گئے، طبیب کو بلایا گیا تو اس نے معائنہ

کر کے کہا "ان کا دل پھٹ گیا ہے" بے ہوشی کی حالت میں بارہ دن گذارنے کے بعد بالآخر دلِ بے قرار کو قرار آہی گیا اور راہی ملک بقا ہوئے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی بہز بن حکیم کے حوالہ سے اس طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ زرارہؒ نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی، جب امام اس آیت پر پہنچا۔ ﴿فاذا نقرفی الناقور فذلك يومئذٍ يوم عسير على الكافرين غير يسير﴾ "جس دن صور پھونکا جائے گا، پس وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا، جس میں ذرا آسانی نہ ہو گی" وہ غش کھا کر گرے، جب ہم نے اٹھایا تو ان کی روح پرواز کر چکی تھی۔

(سنن ترمذی، ج۱، ص:۶۹)

توحید تو یہ ہے خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

☆☆☆☆

بہار ہو کہ خزاں لاالہ الااللہ

عبدالرحمٰن بن ابی نعم بجلی جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، زہد و عبادت میں بڑے مشہور تھے، ان کی خدا خوفی اور فکر آخرت کا یہ عالم تھا کہ بکیر بن عامر کے بقول "اگر ان سے کہا جائے کہ موت کا فرشتہ آپ کی روح قبض کرنے آیا ہے تو اس خبر سے ان کی حالت میں ذرہ بھی فرق نہیں آئے گا"...... ایک دن وعظ و نصیحت کی غرض سے وہ حجاج بن یوسف کے پاس گئے، حجاج کے ظلم سے کون ناواقف ہو گا، نصیحت فرمائی اور ظلم کے انجام کی طرف توجہ دلائی تو حجاج نے اس کا نقد صلہ دیا، حکم دیا کہ "اسے تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کردو" اس حالت میں پندرہ دن گذر گئے، جہاں نہ کھانا، نہ پینا، نہ روشنی اور نہ زندگی کا کوئی سامان، حجاج نے کہا "اب اس کی لاش نکال کر دفن کردو" چنانچہ ان کی لاش نکالنے کے لیے حجاج کے

کارندوں نے جب دروازہ کھولا تو دیکھا کہ وہ کھڑے ہو کر نماز میں مشغول ہیں کہ ؎

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

حجاج کو ان کی یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھیں آزاد کر دیا۔

(تهذيب التهذيب: جلد ٦ ص:٢٨٦)

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

بُنان حمال چوتھی صدی ہجری کے بزرگوں میں سے ہیں، اصل بغداد کے تھے لیکن مصر میں رہنے لگے تھے، عوام وخواص دونوں میں ان کی بڑی مقبولیت تھی، اللہ والوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، وہ دلوں کے بے تاج بادشاہ ہوتے ہیں، حمال نے بادشاہ مصر ابن طولون کو ایک مرتبہ نصیحت فرمائی، ابن طولون تاب سخن نہ لا سکا اور ناراض ہو کر اس نے حکم دیا کہ انھیں خونخوار شیر کے سامنے ڈال دیا جائے، انسان اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے سزا کے بھی عجیب طریقے ایجاد کرتا ہے، سزا کا جو طریقہ جس قدر سخت ہو گا، اس کے جذبۂ انتقام کو اسی قدر ٹھنڈک پہنچے گی، بنان حمال کو خونخوار شیر کے سامنے ڈال دیا گیا، شیر لپکا پھر رک کر ان کے جسم کو سونگھنے لگا، دیکھنے والے ان کے جسم کے چیر پھاڑنے کا نظارہ کرنا چاہتے تھے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! جب دیکھا کہ شیر انھیں کچھ نہیں کہہ رہا، تب انھیں اس کے سامنے سے اٹھا دیا، اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہوئی کہ جب ان سے پوچھا گیا "شیر کے سونگھتے وقت آپ کے دل پر کیا گذر رہی تھی؟" فرمانے لگے "میں اس وقت درندے کے جوٹھے کے متعلق علماء کے اختلاف کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کا جوٹھا پاک ہے یا ناپاک"

(حلية الأولياء: ج: ١٠ ص: ٣٢٤)

موت آدمی کے سامنے ہو اور وہ بھی اس ہیبت ناک منظر کے ساتھ لیکن ذہن، فقہ کے ایک اختلافی مسئلہ میں مگن رہے، ایسے اعلام اور یگانہ روزگار شخصیات سے انسان کیا، درندے کیوں محبت نہیں کریں گے، یقیناً اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی، جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ!

تقدیر کا قاضی

چوتھی صدی ہجری میں منصور نامی ایک شخص اندلس کا حکمران گذرا ہے، اس نے کسی جرم میں ایک آدمی کو گرفتار کرلیا، مجرم کی والدہ نے بیٹے کی رہائی کے لیے رحم کی اپیل کی جس سے منصور مزید بگڑ گیا اور قلم ہاتھ میں لے کر لکھنا چاہا "اسے پھانسی دی جائے" لیکن لکھا "اسے رہا کیا جائے" وزیر نے وہ رقعہ لے کر اس کی رہائی کا حکم جاری کیا، منصور نے پوچھا، کیا لکھا؟ کہنے لگا "فلاں کی رہائی کے لئے لکھا" منصور بھڑک اٹھا "اسے پھانسی دی جائے، رہائی کا کس نے کہا ہے" وزیر موصوف نے اس کو پرچی تھما دی جس پر "اسے رہا کیا جائے" لکھا تھا، کہنے لگا، یہ غلطی سے لکھ دیا ہے، اس کو پھانسی دینی ہے اور سابقہ حکم مٹا کر لکھنا چاہا "اسے پھانسی دی جائے" لیکن لکھا "اسے رہا کیا جائے" وزیر نے حکم کے مطابق رہائی کا حکم دیا، منصور نے پوچھا "کیا لکھا؟" کہنے لگا "فلاں کی رہائی کے لیے لکھا" منصور آگ بگولا ہوا "اسے پھانسی دینی ہے پھانسی، رہائی کا کس نے کہا ہے" وزیر نے پھر اسی کا لکھا ہوا رقعہ سامنے کیا جس میں رہائی کے لیے لکھا تھا، کہنے لگا "یہ غلطی ہوگئی ہے" لیکن تیسری بار بھی اسی طرح ہوا، منصور کے قلم سے پھانسی کی بجائے اس کے لیے آزادی کا پروانہ جاری ہوا، جب تین بار اس طرح ہوا تو تقدیر کے قاضی کے سامنے منصور کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا، کہنے لگا "اسے میرے نہ چاہنے کے باوجود رہا کر دیا جائے، اللہ جس کو رہا کرنا چاہے، میں اسے نہیں روک سکتا ہوں"۔ جسے اللہ رکھے اس کو کون فنا کر سکتا ہے!

(جذوة المقتبس في ذكر ولاة الأندلس، ص:۱۱۸)

۵۰

زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

عامر بن حطان خارجی تھا اور حجاج بن یوسف کے مخالفین میں سے تھا، حجاج نے اسے گرفتار کیا، جلاد سے کہا "بدکار عورت کے اس بیٹے کی گردن اڑادو" عامر نے بڑے پروقار انداز میں سر اٹھا کر کہا:

"حجاج! تمہارے بڑوں نے تمہاری بڑی غلط تربیت کی ہے، موت کے بعد رہ کیا جاتا ہے، میں جواباً اسی طرح کی گالی تمہیں دوں تو مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے لیکن گالی دینا بہادروں اور شرفاء کے شایان شان نہیں"

یہ گالی کا باعث نجات جواب تھا، حجاج نے اس کا یہ جملہ سن کر شرمندگی سے سر جھکا لیا، پھر اس سے کہا "تمہارے ساتھ احسان کیا جاسکتا ہے؟" عامر نے کہا "کیوں نہیں" چنانچہ حجاج نے گھوڑا اور زادراہ دے کر اسے اپنے علاقے کی طرف رخصت کیا، عامر وہاں پہنچا تو اس کے قبیلہ کے لوگوں نے کہا "آپ کو اللہ نے آزادی دی ہے، حجاج نے نہیں، بھرپور تیاری کے ساتھ ہمیں دوبارہ حجاج پر حملہ کرنا چاہئے" لیکن عامر نے کہا "حجاج نے مجھ پر احسان کیا ہے اور اس احسان نے میرے ہاتھ باندھ لیے ہیں، اب میں اس کے خلاف لڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا"۔

(العفو والاعتذار لأبی الحسن الرقام: ص:۵۵۹)

☆☆☆☆

حق پسند

عبیداللہ بن حسن عنبری دوسری صدی ہجری کے اکابر علماء میں سے ہیں، وہ بصرہ کے قاضی بھی رہے، ان کے شاگرد عبدالرحمٰن بن مہدی نے ان سے ایک مسئلہ پوچھا تو انھوں نے اس کا جواب درست نہیں دیا، شاگرد نے کہا "حضرت! شاید آپ سے غلطی ہو گئی، صحیح جواب یہ ہونا چاہئے" بڑے علماء اپنی غلطی کی اصلاح سے نہیں شرماتے اور وہ بڑے ہوتے بھی اسی لیے ہیں، بڑا ہونا یہ نہیں کہ غلطی معلوم ہونے کے بعد بھی اسی پر ڈٹا رہا جائے، یہ بڑائی نہیں، ہٹ دھرمی کہلاتی ہے، عبیداللہ نے اپنے شاگرد کے صحیح جواب سننے کے بعد بہت ہی کار آمد جملہ ارشاد فرمایا، فرمایا "آپ چھوٹے ہیں لیکن بات آپ ہی کی درست ہے، میں بھی آپ ہی کے جواب کی طرف رجوع کرتا ہوں اس لیے کہ باطل میں "سر" اور "رئیس" بننے سے مجھے حق میں "دُم" اور "تابع" بننا زیادہ محبوب ہے"۔

(حلية الأولياء ج:۹، ص:٦)

غمِ آخرت کا چراغ

ربیع بن خُثیم جلیل القدر تابعی اور تاریخ اسلام کے عظیم رجال میں سے ہیں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد تھے، حضرت ابن مسعودؓ انھیں دیکھ کر فرماتے تھے...... "بخدا، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو دیکھتے تو ضرور آپ سے محبت فرماتے" ایک دن اپنے استاذ کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے جارہے تھے، لبِ دریا لوہاروں کی بھٹیاں تھیں جن سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے، وہ دیکھ کر قرآن کریم کی یہ

آیت ان کی زبان پر آگئی ﴿إذا رأتهم من مكان بعيد سمعوا لها تغيظا وزفيرا﴾ (وہ دوزخ ان کو دور سے دیکھے گی تو وہ جہنمی اس کا جوش وخروش سنیں گے) بے ہوش ہو کر گر پڑے اور اگلی صبح تک بے ہوش رہے۔

(تعليقات رسالة المسترشدين: ١٢٤)

یہ خوف در حقیقت غم آخرت کا چراغ ہے اور یہ چراغ صرف دل مرد مؤمن میں روشن رہتا ہے، قرآن کریم نے فرمایا: ﴿يخافون يوما تتقلب فيه القلوب والابصار﴾ یہ چراغ جسے نصیب ہو اس کے دل کی کائنات ہی بدل جاتی ہے، پھر کبھی آہ لب سے نکلتی ہے، کبھی اشک آنکھ سے ڈھلتے ہیں ؂

کبھی آہ لب سے نکل گئی، کبھی اشک آنکھ سے ڈھل گئے
یہ تمھارے غم کے چراغ ہیں، کبھی بجھ گئے، کبھی جل گئے

پسند آئی انہیں اک ادائے عاشقانہ

امام ابوداودؒ محدثین کے امام ہیں، صحاح ستہ میں شامل ان کی سنن، ان کے زندہ وجاوید ہونے کے لیے کافی ہے، ایک بار وہ کشتی میں سفر کر رہے تھے، دریا کے کنارے ایک آدمی کو چھینکنے کے بعد "الحمدللہ" کہتے ہوئے سنا، چھینکنے والا "الحمدللہ" کہے تو جواب میں "يرحمك الله" کہنا سنت بھی ہے اور مسلمان بھائی کا حق بھی! امام کی کشتی آگے نکل گئی، آپ نے ایک دوسری چھوٹی کشتی ایک درہم کے عوض کرایہ پر لی، چھینکنے والے کے پاس آئے اور انھیں "يرحمك الله" کہا، اس نے جواب میں "يهديكم الله" (اللہ آپ کو ہدایت دے) کہا، امام واپس اپنی کشتی پر آگئے، ساتھیوں نے ان سے اس تکلف کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے "مجھے خیال ہوا کہ ہو سکتا ہے یہ آدمی مستجاب الدعوات ہو، اللہ کے ہاں اس کی دعا قبول ہوتی ہو، میرے "يرحمك الله" کہنے کے جواب میں وہ "يهديكم الله" کہے گا تو

بہت ممکن ہے اس کی یہ دعا میرے حق میں قبول ہو جائے، اس لیے میں کشتی لے کر اس کے پاس گیا"۔

کہتے ہیں جب سفر کرتے ہوئے رات کو کشتی کے مسافر سو گئے تو سب نے یہ ہاتف غیبی سنی کہ آواز آرہی ہے "کشتی والو! ابو داود نے ایک درہم کے عوض اللہ سے جنت خرید لی ہے"۔

(شرح الشنوائي على مختصر ابن أبي جمرة، ص: ۲۹۰)

ایک قلم کے لیے......

حضرت عبداللہ بن مبارک کے نام سے کون ناواقف ہو گا، اپنے دور میں امام المسلمین تھے، ان کے زہد و تقوی اور دعوت و جہاد کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز واقعات پڑھ کر آج بھی آدمی کے ایمان میں تازگی، روح میں بالیدگی اور جذبات میں زندگی کی موجیں مچلنے لگتی ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے شام میں کسی سے قلم مستعار لیا، واپس کرنا بھول گئے اور ایران کے شہر مرو آئے تو وہ قلم یاد آیا، وہاں سے دوبارہ شام کا سفر کیا اور جا کر قلم اس کے مالک کو لوٹایا۔

(تاریخ بغداد، ج:۱۰، ص:۱۶۷)

پاکباز و بے نیاز

شمس الدین محمد بن عبدالرحیم مقدسی ساتویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، وہ اپنے وقت میں شام کے مشہور بزرگوں میں سے تھے اور مرجع خلائق تھے، ایک بار کسی پہاڑ کے پاس اپنے مکان کے لیے جگہ کھود رہے تھے، ان کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں، وہ بھی ان ہی کی طرح پارسا اور پاکباز خاتون تھیں، زمین کھودتے ہوئے انھیں مدفون دنانیر کی بھری تھیلی ملی تو "اناللہ............" پڑھنے لگے پھر اس کھودی ہوئی جگہ کو اسی طرح بھر دیا جیسے پہلے تھی اور

بیوی سے کہا" یہ ہمارے لیے غالباً آزمائش ہے، ہو سکتا ہے یہ تھیلی کسی نے دفن کی ہو اور ضرورت کے وقت وہ اس کو نکالے، اس لیے کسی سے اس جگہ کے متعلق تذکرہ نہیں کرنا" چنانچہ دونوں نے فقر و حاجت مندی کے باوجود اس تھیلی کو وہیں چھوڑا اور چل دیئے۔

(شذرات الذهب لابن العماد، ج: ٥، ص: ٤٠٦)

اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیا لے کر

فضیل بن عیاض دوسری صدی ہجری کے مشہور بزرگ اور عالم ہیں، تقوی و عبادت میں ضرب المثل تھے، اونچے درجے کے محدث اور فقیہ تھے، ان کی زندگی کے ایمان پرور واقعات روح و قلب دونوں کو گرما دیتے ہیں اور دل کی سرد انگیٹھی میں ایمان کی حرارت محسوس ہونے لگتی ہے۔

پڑھنے والوں کو عجیب محسوس ہوگا کہ یہ جلیل القدر امام پہلے مشہور زمانہ ڈاکو تھے، ان کی وجہ سے راتوں کو چلنے والے قافلے سفر روک لیتے اور کہتے "آگے ڈاکو فضیل کے حملے کا اندیشہ ہے" اک عشق خراباتی کا واقعہ ان کی زندگی میں انقلاب کا سبب بنا، لکھا ہے کہ انھیں ایک لڑکی سے محبت ہو گئی، دیوار پھلاند کر اس کے گھر میں داخل ہونا چاہ رہے تھے کہ قرآن کریم کی تلاوت کی آواز سنی اور تلاوت کرنے والا یہ آیت پڑھ رہا تھا۔

﴿ الم يان للذين آمنوا ان تخشع قلوبهم لذكر الله............ ﴾

"کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے لیے جھک جائیں............"

فضیل نے سنا تو کہا "ہاں میرے رب! کیوں نہیں"...... قرآن کریم کی اس آیت نے ان کے دل کی ساری کثافتوں کو دھو ڈالا، توبہ کی اور ایسی کہ امام اور محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ولایت کے بلند مرتبے پر فائز ہوئے، بعد میں جب وہ قرآن کریم کی تلاوت

سنتے یا کرتے تو اس قدر روتے کہ دیکھنے والوں کو رحم آجاتا ڈھل رہے ہیں مرے اشکوں کے گہر ان کے لیے

موتی سمجھ کر شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے

(تہذیب التہذیب، ج:۸، ص:۲۹٤ و ۲۹٦)

یہ واقعہ پڑھ کر مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی ایک مناجاتی نظم یاد آرہی ہے، اس کے دو بند آپ بھی پڑھئے:۔

سرگشتہ و درماندہ، بے ہمت و ناکارہ
وارفتہ و سرگردان، بے مایہ و بے چارہ
شیطان ستم خوردہ ،اس نفس کا دکھیارہ
ہر سمت غفلت کا چھائے ہوئے اندھیارہ
آج اپنی خطاؤں کا لادے ہوئے پشتارہ
دربار میں حاضر ہے اک بندہ آوارہ
آیا ہوں تیرے در پہ خاموش نوا لے کر
نیکی سے تہی دامن انبارِ خطا لے کر
لیکن تیری چوکھٹ سے امید سخا لے کر
اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیا لے کر
سینے میں تلاطم ہے، دل شرم سے صد پارہ
دربار میں حاضر ہے اک بندۂ آوارہ

☆☆☆☆

مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا، انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مسئلہ خلق قرآن میں امام احمد ابن حنبلؒ کو کوڑے مارنے کا واقعہ تاریخ اسلام کے مشہور واقعات میں سے ہے، امام اس آزمائش میں کامیاب ہوئے تو بعد میں کبھی کبھی فرماتے "اللہ ابو الہیثم پر رحم فرمائیں، اللہ اس کی مغفرت فرمائیں، اللہ اس سے درگذر فرمائیں" ان کے بیٹے نے ان سے ایک دن پوچھا کہ "یہ ابو الہیثم کون ہیں جن کے لیے آپ دعا کرتے رہتے ہیں؟ فرمایا" آپ اسے نہیں جانتے ہیں؟" کہا "نہیں" فرمایا "جس دن مجھے کوڑے مارنے کے لیے نکالا گیا تھا تو میں نے دیکھا کہ پیچھے سے ایک آدمی میرے کپڑے کھینچ رہا ہے، میں نے مڑ کر دیکھا تو اس نے پوچھا" آپ مجھے جانتے ہیں؟" میں نے کہا "نہیں" کہنے لگا "میں مشہور جیب تراش اور ڈاکو ابو الہیثم ہوں، سرکاری ریکارڈ میں یہ بات محفوظ ہے کہ مجھے مختلف اوقات میں اٹھارہ ہزار کوڑے مارے گئے ہیں لیکن میں نے حقیر دنیا کی خاطر شیطان کی اطاعت پر پوری استقامت کا مظاہرہ کیا آپ تو دین کے ایک بلند ترین مقصد کے لیے قید ہوئے ہیں، اس لیے کوڑے کھاتے ہوئے دین کی خاطر رحمان کی اطاعت پر صبر واستقامت سے کام لیجئے گا"۔

اس کی اس بات سے امام احمد کا حوصلہ مزید مضبوط ہوا، معلوم نہیں ابو الہیثم کو اپنا یہ جملہ بعد میں یاد بھی رہا تھا کہ نہیں، لیکن امام احمد کو یاد رہا سب ذرا ذرا کہ زندگی کی ایک کٹھن منزل میں کسی کے جملے سے حوصلہ بلند ہوا تھا، مردِ مؤمن کی شان یہی ہوتی ہے، وہ نیکی فراموش نہیں ہوتا، وہ احسان اور نیکی کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے، امام کو زندگی بھر جب کبھی ماضی کے وہ لمحات یاد آتے تو دعاؤں کے پھول لے کر یادوں کے مزار پر نچھاور کر لیتے

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب سرد ہوا چلی، میں نے تجھے یاد کیا

(مناقب الإمام أحمد بن حنبل لابن الجوزي: ص:٣١٦)

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز

امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ ہارون الرشید کے زمانے میں پورے عالم اسلام کے قاضی القضاۃ تھے، ایک بار ان کے پاس خلیفہ ہارون الرشید اور ایک نصرانی کا مقدمہ آیا، امام نے فیصلہ نصرانی کے حق میں کیا، اس طرح کے درخشاں واقعات تاریخ اسلام کے ورق ورق پر بکھرے پڑے ہیں، لوگ اس کو "دور ملوکیت" کہتے ہیں، وہ کس قدر مبارک "دور ملوکیت" تھا کہ ایک طاقتور بادشاہ اور خلیفہ اپنی رعایا میں سے ایک غیر مسلم کے ساتھ عدالت کے کٹہرے میں فریق بن کر حاضر ہیں، امام ابویوسفؒ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو فرمانے لگے:

> "اے اللہ! تجھے معلوم ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ قضا میں مقدمات کے فیصلے میں کسی بھی فریق کی جانب داری نہیں کی، حتی کہ دل میں کسی ایک فریق کی طرف میلان بھی نہیں ہوا، سوائے نصرانی اور ہارون الرشید کے مقدمے کے کہ اس میں دل کا رجحان اور تمنا یہ تھی کہ حق ہارون الرشید کے ساتھ ہو اور فیصلہ حق کے مطابق اسی کے حق میں ہو لیکن فیصلہ دلائل سننے کے بعد ہارون الرشید کے خلاف کیا"۔

یہ فرما کر امام ابویوسف رونے لگے اور اس قدر روئے کہ دل بھر بھر آیا۔

(الدر المختار: ج:٤، ص:٣١٣، والقضاء فی الإسلام لعارف النکدی، ص:٢٥)

اس سے امام ابو یوسف کے تقوی کے بلند مقام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مقدمہ میں دل کا رجحان طبعی طور پر ایک فریق کی طرف تھا اور فیصلہ بھی اس کے خلاف ہوا لیکن اس طبعی رجحان پر بھی انہیں خوف رہا کہ کہیں پکڑ نہ ہو جائے، اللہ اکبر! زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے!!

گام گام احتیاط

امام ابو حنیفہؒ نے تجارت میں اپنے ایک شریک کے پاس کپڑا بھیجا اور بتایا کہ کپڑے میں یہ عیب ہے، خریدار کو عیب سے آگاہ کر دینا، اس نے وہ کپڑا فروخت کیا لیکن خریدار کو عیب بتلانا بھول گیا، امام اعظمؒ کو جب معلوم ہوا تو اس سے حاصل ہونے والی ساری قیمت صدقہ کر دی جس کی رقم تیس ہزار درہم تھی۔

(الخیرات الحسان فی مناقب الإمام أبی حنیفة النعمان، ص:۴۳)

جو اس در کا بھکاری ہے وہ قسمت کا سکندر ہے

ایک آدمی کسی امیر کے پاس اپنی ضرورت کے سلسلے میں آیا، دیکھا کہ وہ امیر سجدہ میں پڑا اللہ سے مانگ رہا ہے، کہنے لگا "یہ خود دوسرے کا محتاج ہے، پھر میں اس کا محتاج کیوں بنوں؟ میں اپنی حاجت اس ذات کے سامنے کیوں پیش نہ کردوں جہاں مصلحتاً دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں" امیر نے اس شخص کی یہ بات سن لی، اسے بلا کر دس ہزار کی خطیر رقم دی اور کہا "یہ رقم تجھے اسی ذات نے دی ہے جس سے میں سجدے کی حالت میں مانگ رہا تھا اور جس کی طرف تو نے رجوع کیا"

(اللقط فی حکایات الصالحین لابن الجوزی، الحکایة:۵۰۷)

آئے تھے ان کو ڈھونڈنے خود سے بھی بے خبر گئے

عبید بن عمیر مشہور تابعی گذرے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی فصیح زبان دی تھی، ان کی مجلس میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی بیٹھا کرتے تھے اور ان کے دل پر اثر کرنے والی گفتگو سے پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں ایک جوان عورت تھی، شادی شدہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے غیر معمولی حسن سے نوازا تھا، یہ حسن بھی عجیب چیز ہے، بڑے بڑے بہادر پہلوان اور سورما اس کے ایک انداز غلط نگاہ کے وار سے ڈھیر ہو کر بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں، وہ بہادر جو کسی کے وارے میں نہ آتا ہو، بسا اوقات حسن کی ایک بھولی سی نظر سے اس کے قلب و جگر کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے، یہ خاتون ایک دن آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہی تھی، شوہر سے کہنے لگی "کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو یہ چہرہ دیکھے اور اس پر فریفتہ نہ ہو" شوہر نے کہا "ہاں ایک شخص ہے" کہنے لگی "کون؟" کہا "عبید بن عمیر" اسے شرارت سوجھی، کہنے لگی "آپ مجھے اجازت دیں، میں ابھی انھیں اسیر محبت بنائے دیتی ہوں" شوہر نے کہا "اجازت ہے" وہ عبید بن عمیر کے پاس آئی، کہا "مجھے آپ سے تنہائی میں ایک ضروری مسئلہ پوچھنا ہے" چنانچہ عبید بن عمیر مسجد حرام کے ایک گوشے میں اس کے ساتھ الگ کھڑے ہو گئے تو اس نے اپنے چہرے سے حجاب سرکایا اور اس کا چاند ایسا چہرہ قیامت ڈھانے لگا، عبید نے اسے بے پردہ دیکھ کر فرمایا "خدا کی بندی! اللہ سے ڈر" کہنے لگی "میں آپ پر فریفتہ ہو گئی ہوں، آپ میرے متعلق غور کر لیں" دعوت گناہ کی طرف اشارہ تھا، عبید بن عمیر اس کے جھانسے میں آنے والے کب تھے، ان کی حالت تو کہہ رہی تھی

اے باد بہاری! مت چھیڑ ہمیں، لگ رہ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں

عبید نے اس سے کہا کہ میں تجھ سے چند سوالات پوچھتا ہوں، اگر تو نے صحیح اور درست جوابات دیئے تو میں تیری دعوت پر غور کر سکتا ہوں، اس نے حامی بھری، فرمایا ''موت کا فرشتہ تیری روح قبض کرنے آجائے اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا''؟ کہنے لگی ''ہر گز نہیں'' فرمایا ''جواب درست'' فرمایا ''لوگوں کو ان کے اعمال نامے دیئے جا رہے ہوں اور تجھے اپنے اعمال نامہ کے متعلق معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ میں ملے گا یا بائیں میں، اس وقت تجھے یہ گناہ اچھا لگے گا''؟ کہنے لگی ''ہر گز نہیں'' فرمایا ''جواب درست'' فرمایا ''پل صراط کو عبور کرتے ہوئے تجھے اس گناہ کی خواہش ہو گی؟'' کہنے لگی ''ہر گز نہیں'' فرمایا'' جواب درست'' فرمایا ''اللہ کے سامنے اپنے اعمال کے سوال وجواب کے لیے جس وقت تو کھڑی ہو اس وقت اس گناہ میں تجھے رغبت ہو گی''؟ کہنے لگی ''ہر گز نہیں'' فرمایا ''جواب درست'' اس کے بعد اسے مخاطب کر کے کہا ''اللہ کی بندی! اللہ سے ڈر، اللہ نے تجھ پر انعام واحسان کیا ہے، اس کی نافرمانی نہ کر'' چنانچہ وہ گھر لوٹی تو اس کے دل کی کائنات بدل چکی تھی، دنیوی لذتیں اور شوخیاں اسے بے حقیقت معلوم ہونے لگیں، شوہر نے پوچھا ''کیا ہوا؟'' کہنے لگی ''مرد اگر عبادت کر سکتے ہیں تو ہم عورتیں کیوں نہیں کر سکتیں، ہم کیوں پیچھے رہیں'' اور اس کے بعد نماز روزہ اور عبادت میں منہمک ہو کر ایک عابدہ اور پرہیز گار خاتون بن گئی ،اس کا آزاد منش شوہر اس کی حالت دیکھ کر کہا کرتا تھا ''مجھے عبید بن عمیر کے پاس شرارت کے لیے بیوی بھیجنے کا کس نے مشورہ دیا تھا، اس نے تو میری بیوی بگاڑ کر رکھ دی، پہلے ہماری ہر رات شب زفاف تھی، اب اس کی ہر شب، شب عبادت بن گئی ہے، وہ راتوں کو عبادت میں مشغول ہو کر راہبہ بن چکی ہے''

(کتاب الثقات للعجلی، ج:۲، ص:۱۱۹)

واقعتاً مردِ مؤمن کی نگاہ ایمان افروز سے بسا اوقات دل کی دنیا میں انقلاب آجاتا ہے اور عقل وخرد کی شوخی ومستی، جلوۂ ایمان کے سامنے دم توڑنے لگتی ہے ؎

جلووں نے اہل ہوش کو کیسے شکست فاش دی
آئے تھے ان کو ڈھونڈنے، خود سے بھی بے خبر گئے

خوفِ خدا سے چشمۂ صد رنگ ابلتے دیکھا

مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک مرتبہ شاگردوں کے ساتھ تفریح کی غرض سے مدینہ منورہ کے نواح میں نکلے، کھانے کے لیے دستر خوان بچھایا گیا تو قریب سے ایک چرواہے نے گذرتے ہوئے سلام کیا، حضرت ابن عمرؓ نے اسے کھانے کی دعوت دی تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میرا روزہ ہے، فرمایا "اس قدر شدید گرمی میں"؟ کہنے لگا "تیزی کے ساتھ زندگی کے ان گذرتے ہوئے دنوں کو اسی طرح قیمتی بنایا جاسکتا ہے" حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے امتحاناً اس سے فرمایا "ان بکریوں میں سے ایک بکری ہمیں فروخت کردیں، ہم آپ کو اس کی قیمت بھی ادا کردیں گے اور افطار کرنے کے لیے گوشت بھی دیدیں گے" مال کی محبت عجب روگ ہے، جسے لگ جائے، بڑی مشکل سے وہ اس سے پناہ حاصل کرتا ہے، یہاں آکر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگانے لگ جاتے ہیں، دن رات سربسجود ایسے عابد بھی ہیں کہ جہاں معاملہ دنیا اور مال کا آگیا، ان کا حب مال ان کے تقوی کو شکست دے گیا، میدان جہاد میں جان ہتھیلی پر رکھ کر سرفروشانہ کارنامے انجام دینے والے ایسے جانباز مجاہد بھی بکثرت پائے جاتے ہیں کہ جب مال غنیمت کی تقسیم کا مرحلہ شروع ہوا، اس میں کہیں دین اور دنیا کے تقاضے مختلف ہوگئے اور وہ محبت مال کے قتیل بن گئے، آہ! یہ دنیا کن کن خوبصورتیوں کے ساتھ آتی ہے اور دل کی کائنات پر چھا چھا جاتی ہے، لیکن عہد صحابہؓ کا وہ چرواہا محبت مال کی زلفوں کا اسیر نہ تھا، وہ تقوی کی حقیقی بلندیوں پر تھا، کہنے لگا "یہ بکریاں میری نہیں، آقا کی ہیں" حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا "ایک بکری آقا کو نہ ملی تو وہ کیا بگاڑ سکتا ہے (اس کے گم ہونے کا بہانہ کیا جاسکتا ہے) کہنے لگا" فأين الله؟" (اللہ کہاں جائے گا؟) ان

کے اس جملے سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور بار بار اس کا یہ جملہ دہراتے ہیں "اللہ کہاں جائے گا، اللہ کہاں جائے گا"۔

مدینہ منورہ واپس ہوئے تو مالک سے وہ غلام چرواہا اور ساری بکریاں خریدیں، غلام کو آزاد کیا اور بکریاں اسے ہبہ کیں۔

(اسد الغابة فی معرفة الصحابة، ج:٣، ص:٢٢٨)

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم

شوال آٹھ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اور غزوہ حنین سے قبل آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں انصار و مہاجرین کے تین سو پچاس افراد پر مشتمل ایک جماعت بنو جذیمہ کی طرف اسلام کی دعوت کی غرض سے بھیجی، وہ لوگ اسلام کا اقرار ٹھیک طرح نہ کر سکے اور "اسلمنا" (ہم نے اسلام قبول کیا) کی بجائے "صبأنا" (ہم نے اپنا دین چھوڑ دیا) کہتے رہے، چونکہ کفار قریش اسلام قبول کرنے والے کے لیے " اسلم فلان" کی جگہ " صبأفلان" استعمال کرتے تھے اس لیے بنو جذیمہ نے اسلام کا اقرار " صبأنا" "صبأنا" کہہ کر کیا، صبأ کے معنی ایک دین سے دوسرے دین کی طرف نکلنے کے ہیں، اس لفظ میں چونکہ اقرار اسلام کا مفہوم اچھی طرح واضح نہیں، اس لیے حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان میں سے بعض کو قتل کیا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو بہت ناراض ہوئے اور فرمایا " اللهم انی أبرأ الیك مما صنع خالد" اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو مال دے کر بنو جذیمہ کے پاس بھیجا اور ان سب مقتولین کی دیت مسلمانوں کی طرف سے ادا کی گئی۔

(عمدة القاری: ج ١٧ ص:٣١٣۔)

نسائی اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے سند صحیح کے ساتھ اس واقعہ میں انسانی عشق اور مرنے والے پر مرنے کا ایک عجیب قصہ نقل کیا ہے کہ بنو جذیمہ کے ان قیدیوں میں سے ایک قیدی مسلمانوں سے کہنے لگا "میں بنو جذیمہ کا آدمی نہیں ہوں، ان کی ایک عورت سے مجھے عشق ہے، آپ ان عورتوں کے پاس مجھے لے چلیں، میری تمنا ہے کہ مرنے سے قبل اک نظر اس کو دیکھ لوں" قیدی کو عورتوں کی جانب لایا گیا، اس نے وہاں چند شعر پڑھے، پھر جوں ہی اس قیدی کو قتل کیا گیا، محمل سے ایک عورت اس کی نعش پر گر پڑی اور دو تین چیخوں کے بعد اس کا فلسفہ زندگی بھی ختم ہو گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا گیا تو فرمایا "اما کان فیکم رجل رحیم"؟ (کیا تم میں سے کوئی بھی رحم دل آدمی نہیں تھا؟)

جو تجھ بِن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو ہم وفا کر چلے

(فتح الباری: ج ۸۔ ص: ۵۸)

حقِ وفا ہم ادا کر چلے

یہود کے مشہور قبیلہ بنو قریظہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غزوۂ خندق میں کفار قریش کی مدد کی، غزوہ خندق سے فارغ ہو کر مسلمانوں نے یہود بنو قریظہ پر حملہ کیا اور تقریباً سارے قبیلے کو گرفتار کر لیا، امام مغازی ابن اسحاق نے بنو قریظہ کے قیدیوں میں ایک قیدی "زبیر بن باطا" کا واقعہ لکھا ہے کہ اس نے زمانۂ جاہلیت کی مشہور جنگ "بعاث" میں انصار کے مشہور صحابی حضرت ثابتؓ بن قیس پر کچھ احسان کیا تھا، زبیر بن باطا اس وقت بوڑھا ہو کر اندھا ہو چکا تھا، حضرت ثابتؓ اس کے پاس آئے اور کہا "مجھے پہچانتے ہو؟" کہنے لگا، "مجھ جیسا آپ جیسے کو کہاں بھول

سکتا ہے ؟" حضرت ثابتؓ نے کہا "میں چاہتا ہوں آج آپ کے احسان کا بدلہ دوں" کہنے لگا، "ان الکریم یجزی الکریم" (شریف آدمی شریف کا بدلہ چکاتا ہے) حضرت ثابتؓ حضور ﷺ کے پاس آئے اور زبیر کی آزادی کی درخواست کی، آپ ﷺ نے ان کی درخواست پر اس کو آزاد کر دیا، حضرت ثابتؓ نے آکر اطلاع دی، کہنے لگا، "ایسے بوڑھے کی حیات میں کیا لطف جس کے اہل و عیال نہ ہوں"، حضرت ثابتؓ نے جاکر دربار نبوی سے اس کے اہل و عیال کی آزادی کا بھی پروانہ حاصل کیا، آکر بتایا تو کہہ اٹھا "حجاز میں اہل خانہ ہوں لیکن مال نہ ہو تو گزران زندگی کیونکر ؟" حضرت ثابتؓ نے جاکر اس کا مال واپس کروادیا تو اب اندھا یہودی حضرت ثابتؓ سے پوچھنے لگا، کعب بن اسد کا کیا ہوا؟ کہا "قتل ہوا" پھر پوچھا، حی بن اخطب اور عزال بن شموال کا کیا بنا؟ فرمایا "قتل کیے گئے" دریافت کیا، باقی حضرات کا کیا حشر ہوا؟ حضرت ثابتؓ نے کہا "سب قتل کر دیئے گئے" تو بوڑھے یہودی نے حضرت ثابتؓ سے کہا کہ میرے احسان کا بدلہ یہ ہے کہ آپ مجھے بھی میری قوم کے ساتھ ملادیں کہ اس کے بعد زندگی میں کیا خیر ہے، حضرت ثابتؓ نے اس کو آگے بڑھایا اور اس کی گردن بھی اڑادی گئی......

(سیرة ابن هشام: ج ٣ ص ٣٥٣_٣٥٤)

سر مقتل وہ صدا کر چلی

بنو قریظہ کے ان قیدیوں میں ایک عورت بھی تھی، اس عورت کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقتولین کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے لیکن اس کے باوجود قتل سے چند ساعات قبل حضرت عائشہؓ کے ساتھ باتیں کرتی رہی اور بات بات پر ہنستی رہی، کہ اتنے میں اس کا نام پکارا گیا، اٹھ کر قتل گاہ کی طرف جانے لگی، حضرت عائشہؓ نے پوچھا، کہاں؟ کہنے لگی "سوئے مقتل جارہی ہوں، میں نے ایک جرم کیا تھا، اس کی سزا پانے جاتی ہوں" چنانچہ اس کی گردن اڑائی گئی، حضرت عائشہؓ بعد میں فرمایا کرتی تھیں کہ قتل سے چند لمحے پہلے اس عورت کی ہنسی خوشی باتوں پر آج تک مجھے تعجب ہوتا ہے......

(البداية والنهاية: ج ٤ ص ١٤٩)

چمن کے تخت پر جب شہِ گل کا تجمل تھا

مشہور صحابیہ حضرت ام ایمنؓ کا نام برکۃ بنت ثعلبہ ہے، ایمن آپ کا بیٹا تھا جو آپ کے پہلے شوہر عبید بن زید سے پیدا ہوا، ایمن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کی سعادت اور غزوہ خیبر میں شرف شہادت حاصل ہے، عبید بن زید کے بعد حضرت ام ایمنؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے اور مشہور صحابی حضرت زید بن حارثہؓ سے نکاح کیا اور ان سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے، حضرت ام ایمن نے چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کی تھی اس لیے آپ وقتاً فوقتاً حضرت ام ایمن کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم .... کی وفات ہوئی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فاروق اعظمؓ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام ایمن کے ہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، چلئے آج ہم بھی ان کے ہاں چلتے ہیں، جب یہ دونوں حضرات انکے گھر داخل ہوئے تو حضرت ام ایمن رونے لگیں، انھوں نے کہا کہ "آپ کیوں رو رہی ہیں؟ اللہ کے ہاں اپنے رسول کے لیے جو کچھ ہے وہ اس دنیا سے بہتر ہے" فرمانے لگیں "میں اس لیے نہیں رو رہی ہوں کہ آپ کی وفات ہو گئی ہے بلکہ اس لیے رو رہی ہوں کہ وحیٔ آسمانی کا سلسلہ منقطع ہو گیا"...... یہ سن کر حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروق بھی رونے لگے۔

(الاصابة: ج ٤ ص ٤٣٢)

یہ واقعہ پڑھ کر بچپن میں سنے ہوئے یہ اشعار یاد آ گئے

چمن کے تخت پر جب شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی، اک شور تھا، اک غل تھا
جب آئے دن خزاں کے کچھ نہ رہا بجز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ، یہاں گل تھا

فکرِ آخرت کے آنسو

غزوۂ موتہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا، ان میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی تھے، اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو رخصت کرنے لگے تو وہ رونے لگے، لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا، میں دنیا سے محبت یا تم سے عشق کی وجہ سے نہیں رو رہا ہوں...... بلکہ اس لیے رو رہا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے...... ﴿وان منکم الا واردها کان علی ربك حتماً مقضیا﴾ یعنی "تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا اس جہنم پر گزر نہ ہو، یہ اللہ جل شانہ کا حتمی اور اٹل فیصلہ ہے" معلوم نہیں کہ اس پر گزرتے ہوئے میرا کیا بنے گا؟ مسلمانوں نے انھیں تسلی دی اور کہا "اللہ آپ کو ہماری طرف صحیح وسلامت لوٹائیں" اس پر حضرت عبداللہؓ نے یہ اشعار پڑھے جن میں انھوں نے اپنے لیے شہادت کی دعا مانگی ہے:

لکننی أسأل الرحمن مغفرةً وضربةً ذات فرغ تقذف الزبدا
اوطعنةً بیدی حران مجهزة بحربة تنفذ الاحشاء والكبدا
حتی یقولوا: اذا مروا علی جدثی ارشدك الله من غازٍ وقد رشدا

چنانچہ وہ اسی غزوہ میں شہید ہوئے۔

(کامل ابن اثیر: ج ۲ ص ۱۵۴۔ وتاریخ طبری: ج ۲ ص ۲۱۹)

☆☆☆☆

عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جان

حافظ ابن حجرؒ نے "الاصابہ" میں حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے مناقب میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ کے دور خلافت میں رومیوں سے جنگ کے دوران آپ چند مسلمانوں کے ساتھ گرفتار ہوئے، شاہ روم نے ان سے کہا کہ آپ نصرانی بن جائیں تو میں آپ کو اپنی حکومت میں شریک کرلوں گا لیکن حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے نصرانیت قبول کرنے سے انکار کردیا، جس کی وجہ سے شاہ روم نے انھیں تختہ دار پر باندھ کر حکم دیا کہ ان پر تیر برسائے جائیں لیکن جب دیکھا کہ آپ کے چہرے پر کسی قسم کے خوف کے آثار نہیں ہیں تو وہاں سے انھیں اتارا اور حکم دیا کہ دیگ میں پانی گرم کرکے کھولتے ہوئے پانی میں انھیں ڈال دیا جائے، اس میں ڈالنے کے لیے جب انھیں دیگ کے قریب لے جایا گیا تو رونے لگے، شاہ روم نے رونے کی وجہ پوچھی تو فرمانے لگے "رو اس لیے رہا ہوں کہ میری تمنا ہے کہ میرے لیے سو جانیں ہوں اور ہر جان قربانی کا اس طرح نذرانہ پیش کرکے اپنے رب کے حضور حاضر ہو" شاہ روم کو بڑی حیرت ہوئی، کہنے لگا "تم میرے سر کو بوسہ دیدو، میں تمہیں چھوڑ دوں گا" فرمانے لگے "صرف مجھے نہیں، میرے ساتھیوں کو بھی" شاہ روم نے کہا، ٹھیک ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن حذافہؓ نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور شاہ روم نے حسب وعدہ تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کردیا۔ حضرت فاروق اعظمؓ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آکر حضرت عبداللہ بن حذافہؓ کے سر کو بوسہ دیا۔

(الاصابة فی تمییز الصحابة: ج٢ ص٢٩٦-٢٩٧۔ رقم الترجمة: ٤٦٢٢)

☆☆☆☆

حسن خاتمہ

امام ابوزرعہ مشہور محدث اور فقیہ گذرے ہیں، ان کے انتقال کا بھی عجیب واقعہ ہے، ابو جعفر تستری کہتے ہیں کہ ہم جان کنی کے وقت ان کے پاس حاضر ہوئے اس وقت ابو حاتم، محمد بن مسلم، منذر بن شاذان اور علماء کی ایک جماعت وہاں موجود تھی، ان لوگوں کو تلقین میت کی حدیث کا خیال آیا کہ آں حضرت ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: لقنوا موتاکم لاآله الا الله...... (اپنے مردوں کو لاالہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو) مگر ابوزرعہ سے شرمارہے تھے، اوران کو تلقین کی ہمت نہیں ہورہی تھی، آخر سب نے سوچ کر یہ راہ نکالی کہ تلقین کی حدیث کا مذاکرہ کرنا چاہئے، چنانچہ محمد بن مسلم نے ابتدا کی...... حدثنا الضحاك بن مخلد عن عبدالحميد بن جعفر...... اور اتنا کہہ کر رک گئے، باقی حضرات نے بھی خاموشی اختیار کی، اس پر ابوزرعہ نے اسی جان کنی کے عالم میں روایت کرنا شروع کیا حدثنا بندار حدثنا أبو عاصمٍ حدثنا عبد الحميد بن جعفر عن صالح بن أبی عريب عن كثير بن مرة الحضرمی عن معاذ بن جبل قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "من كان آخر كلامه لا اله الا الله ...... اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ طائر روح قفس عنصری سے عالم قدسی کی طرف پرواز کر گیا، پوری حدیث یوں ہے "من كان آخر كلامه لآ اله الا الله دخل الجنة (یعنی جس کی زبان سے آخری الفاظ لا اله الا الله نکلے وہ جنت میں داخل ہوگا۔)

(ابن ماجہ اور علم حدیث ص:۸۹)

اپنی کوئی ملک نہ املاک سمجھنا

حضرت ربیع بن خیثم مشہور تابعی ہیں، ان کے زہد و تقوی اور دنیا سے بے رغبتی کے یادگار واقعات تاریخ کی کتابوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں، ایک مرتبہ ان پر فالج کا حملہ ہوا، صاحب فراش ہوگئے، انسان بیمار ہو تو خواہشات کا نخل ہرا ہو جاتا ہے، انہیں مرغی کے

گوشت کھانے کی خواہش ہوئی، چالیس دن تک اس کا اظہار نہیں کیا، اس کے بعد بیوی سے کہہ دیا، انھوں نے مرغی منگوائی، عمدہ پکائی، آپ کے سامنے پیش کی، ابھی آپ نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازے سے فقیر نے خیرات کی صدا لگائی، آپ نے ہاتھ کھینچا، اہلیہ سے فرمایا: "یہ فقیر کو دے آؤ" اہلیہ نے کہا "میں فقیر کو اس سے بہتر چیز دے آتی ہوں" فرمایا "وہ کیا؟" کہنے لگیں "اس کی قیمت" فرمایا "بہت خوب، قیمت لے آؤ" وہ قیمت لے آئیں تو آپ نے فرمایا "یہ کھانا اور قیمت دونوں اس فقیر سائل کو دے آؤ"۔

(صفة الصفوة، ج:۳، ص:۳٤)

یہ تھے خواہشات کو کچلنے والے اصحابِ بلند ذوق و نظر، ہوس چھپ چھپ کر ان کے سینوں میں تصویریں کہاں بنا سکتی تھی! انیس نے خوب کہا ہے

امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام
ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشیدِ لبِ بام
یاں کام کرو ایسا جو آئے وہاں کام
آجائے خدا جانے کب موت کا پیغام
اپنی کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمھیں خاک سب خاک سمجھنا

بہشت کے باسی

عہد صحابہؓ میں ایک حبشی غلام باغ میں کام کر رہا تھا، اس کا کھانا آیا تو ساتھ ہی ایک کتا بھی باغ میں آکر غلام کے پاس کھڑا ہو گیا، غلام نے ایک روٹی اس کے سامنے ڈال دی، وہ کھا کر کھڑا رہا، غلام نے دوسری اور پھر تیسری روٹی بھی ڈال دی اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا، حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ اتفاق سے وہیں کھڑے دیکھتے رہے، انھوں نے غلام سے پوچھا:

"تمہارے لیے روزانہ کتنی روٹیاں آتی ہیں؟" کہا "تین روٹیاں" فرمایا "پھر تینوں کا ایثار کیوں کر دیا؟" غلام کہنے لگا "دراصل یہاں کتے رہتے نہیں ہیں، یہ غریب بھوکا کہیں بڑی دور سے مسافت طے کر کے آیا ہے، اس لیے مجھے اس کو بھوکا واپس کرنا اچھا نہیں لگا" حضرت عبداللہ نے فرمایا "آج خود کیا کھاؤ گے؟" غلام نے کہا "ایک دن فاقہ کرنا کیا مشکل ہے" حضرت عبداللہ بن جعفر سخاوت میں بڑے مشہور تھے، فرمانے لگے "لوگ مجھے سخی کہتے ہیں جبکہ مجھ سے بڑا سخی تو یہ غلام ہے، چنانچہ انھوں نے مالک سے وہ باغ اور غلام خریدا، غلام کو آزاد کر کے باغ اسے ہدیہ کر دیا۔

(إحياء العلوم، ج:۳ ص:۲۵۸)

آواز دی خزاں نے تو بھی نظر میں ہے

ایک شخص اپنی اہلیہ کے ساتھ عمدہ کھانے پر بیٹھا تھا کہ فقیر نے خیرات کی صدا لگائی، فقیر کی یہ آواز اسے بہت بری لگی، اسے جھڑک کر دروازہ سے دھتکارا؟ بے چارہ سائل فقیرانہ آیا تھا اور صدا کر چلا، گردش دوراں دیکھئے کہ یہ شخص خود فقیر ہو گیا، مال و دولت جاتا رہا، بیوی کو طلاق دیدی، اس نے کسی اور سے نکاح کر لیا، یہ دونوں میاں بیوی ایک دن عمدہ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک فقیر نے صدا لگائی، شوہر نے کہا "یہ کھانا اسے دے آؤ" وہ کھانا دے کر واپس ہوئی تو رونے لگی، میاں نے وجہ پوچھی تو کہا "فقیر میرا سابقہ شوہر تھا، اس حالت میں اسے دیکھ کر رونا آیا" اور سائل کو جھڑکنے کا سابقہ قصہ اسے سنایا، اس کا شوہر بولا "بخدا وہ فقیر میں ہی تھا"۔

پژمردگئ گل پہ جب ہنسنے لگی کلی
آواز دی خزاں نے تو بھی نظر میں ہے

(المستطرف، ص:۱۳۳)

بہترین اور بدترین

حضرت لقمان حکیم کے آقا نے ان سے ایک مرتبہ کہا "بکری ذبح کر کے اس کے دو بہترین حصے میرے پاس لے آؤ" انھوں نے بکری ذبح کی اور اس کے دل و زبان آقا کے پاس لے گئے، آقا نے پھر حکم دیا کہ "ایک اور بکری ذبح کر کے اس کے دو بدترین ٹکڑے میرے پاس لاؤ" انھوں نے بکری ذبح کی اور اس مرتبہ بھی اس کے دل و زبان اس کے پاس لے کے گئے، آقا نے پوچھا "میں نے بہترین حصے طلب کئے تو تم یہی لائے، بدترین طلب کئے تب بھی یہی لائے" حضرت حکیم نے فرمایا "میرے آقا! دل و زبان اچھے رہیں تو ان سے بہتر جسم کا کوئی اور عضو نہیں ہو سکتا اور اگر یہ بگڑ جائیں تو ان سے بدتر کوئی عضو نہیں ہو سکتا، یہ بہتر رہیں تو بہترین ہیں، بدتر ہو جائیں تو بدترین ہیں"۔

(تفسیر قرطبی، ج:٤، ص:٦١)

کوئی غم گسار ہوتا، کوئی چارہ ساز ہوتا

حضرت عبدالوہاب بن عبدالمجید ثقفی فرماتے ہیں، میں نے ایک جنازہ دیکھا جس کو تین مرد اور ایک عورت نے اٹھایا تھا، میں نے عورت کی جگہ لے لی، جنازہ کو قبرستان پہنچا کر دفن کرایا، پھر میں نے عورت سے اس کا تعارف پوچھا، کہنے لگی "یہ میرا بیٹا تھا" میں نے دریافت کیا "کیا آپ کے پڑوسی وغیرہ نہیں ہیں؟" کہنے لگی "ہیں، لیکن انھوں نے اسے حقیر جانا کیونکہ یہ مخنث (ہیجڑا) تھا" شیخ عبدالوہاب فرماتے ہیں کہ میں نے اسی رات خواب میں سفید لباس میں ملبوس ایک شخص دیکھا جس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا تھا، اس نے آکر میرا شکریہ ادا کیا، میں نے پوچھا "آپ کون"؟ وہ کہنے لگا "میں وہی

مخنث ہوں جسے تم نے آج دفن کیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لیے بخش دیا کہ لوگ مجھے حقیر سمجھتے تھے" دیکھا آپ نے حقیر سمجھنے کا صلہ...... تب و تاب جاودانہ!

(رسالہ قشیریہ، ص: ۲۲۱۔)

افسوسناک اجتہاد کا خوشگوار نتیجہ

امام ابو حنیفہؒ سے ایک عالم نے دریافت کیا کہ " آپ کو کبھی اپنے کسی اجتہاد پر افسوس اور پشیمانی بھی ہوئی ہے؟" فرمایا کہ " ہاں ایک مرتبہ لوگوں نے مجھ سے پوچھا ایک حاملہ عورت مر گئی ہے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کر رہا ہے، کیا کرنا چاہئے؟" میں نے ان سے کہا "عورت کا شکم چاک کر کے بچہ کو نکالدیا جائے" لیکن بعد میں مجھے اپنے اجتہاد پر افسوس ہوا کیونکہ بچے کے زندہ نکلنے کا تو مجھے علم نہیں، تاہم ایک مردہ عورت کو تکلیف دینے کے فتوی پر مجھے افسوس رہا" پوچھنے والے عالم نے کہا" یہ اجتہاد تو قابل افسوس نہیں بلکہ اس میں تو اللہ کا فضل شامل رہا کیونکہ آپ کے اس اجتہاد کی برکت سے زندہ نکل کر اس مرتبہ کو پہنچنے والا وہ بچہ میں ہی ہوں"۔

(حدائق الحنفیة، ص:۷۰)

بت خانہ بھی رہا، کبھی یہ کعبۂ دل

علامہ حلبیؒ نے سیرت حلبیہ میں مشہور صحابی حضرت خوات بن جبیرؓ کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے قبل ایک دن وہ چند عورتوں کے پاس سے گزرے، ان عورتوں کے حسن نے دل موہ لیا، ان کے پاس بیٹھنے کے لیے یہ بہانہ تراشا کہ میرا اونٹ بھاگ گیا ہے، میرے ساتھ تم رسی بٹ دو، اس بہانہ سے حضرت خوات بن جبیرؓ ان عورتوں کے پاس

بیٹھ گئے، اتفاقاً، اُدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا گزر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم حقیقت حال سمجھ گئے لیکن خاموشی کے ساتھ وہاں سے گزر گئے، بعد میں جب حضرت خوات بن جبیرؓ اسلام لے آئے تو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھا... مافعل بعيرك الشارد؟ ''آپ کے بھاگنے والے اونٹ کا کیا بنا؟'' حضرت خوات بن جبیرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعریض سمجھ گئے اور بڑا خوبصورت جواب دیا، کہا يارسول الله! قيده الاسلام یعنی یارسول اللہ! اس کو تو اسلام نے باندھ لیا، اندازہ لگایئے، اسلام کی آمد سے زندگی کی اخلاقی قدریں کس طرح بدلیں۔

(سیرت حلبیہ ج:۲ ص:۱۴۷)

ہونا ہے تمہیں خاک سب خاک سمجھنا

حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بن عامرؓ کو حمص کا امیر (گورنر) بنایا، ایک عرصہ بعد اہل حمص حضرت عمرؓ کے پاس آئے تو آپؓ نے ان سے کہا ''اپنے فقراء کے نام لکھ دو تاکہ ہم ان کی مدد کر سکیں'' انھوں نے فقراء حمص کے نام لکھ کر پیش کیے تو ان میں ایک نام سعید بن عامرؓ کا تھا، پوچھا، ''کون سعید بن عامر؟'' کہا، ''ہمارا امیر'' پوچھا، ''تمھارا امیر فقیر ہے؟'' کہا، ''جی ہاں! کئی دن گزر جاتے ہیں اور ان کے گھر آگ نہیں جلتی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے اور ایک ہزار دینار ان کے لیے بھیجے۔

جب وہ دینار ان کو ملے تو یک دم ''اناللہ...'' پڑھنے لگے، بیوی نے کہا کیا بات ہے، امیر المؤمنین انتقال کر گئے؟ کہا ''معاملہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، دنیا میرے پاس آنے لگی، فتنہ میرے پاس آنے لگا، مجھ پر چھانے لگا'' کہنے لگی اس کا تو حل ہے، راہ خدا میں تقسیم کر دیجئے'' چنانچہ اگلے دن وہ ساری رقم مجاہدین میں تقسیم کر دی۔

(اسد الغابة، ج:۲، ص:٤٦٣)

جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حضرت حسینؓ اور ان کے باپ شریک بھائی محمد بن حنفیہؒ (ماں کی طرف نسبت ہے جو بنو حنفیہ سے تھیں) میں کسی بات پر تلخی پیدا ہو گئی اور دونوں آپس میں ناراض ہو کر چل دیئے، محمد بن حنفیہؒ نے گھر پہنچ کر درج ذیل مضمون پر مشتمل ایک مکتوب حضرت حسینؓ کی خدمت میں روانہ کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد بن علی کی طرف سے اس کے بھائی حسین بن علی کی طرف "سلام مسنون کے بعد...... آپ کو ایسا مقام و مرتبہ اور شرف و فضیلت حاصل ہے جس تک میری رسائی ممکن نہیں، اس لئے کہ میری والدہ بنو حنفیہ کی ایک خاتون ہیں اور آپ کی والدہ فاطمہ الزھراءؓ دختر رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اگر میری والدہ جیسی عورتوں سے زمین بھر جائے، پھر بھی آپ کی والدہ کے برابر نہیں ہو سکتیں، لہذا اس مقام و مرتبہ کی بنا پر میرا مکتوب پڑھتے ہی مجھے راضی کرنے میرے ہاں چلے آیئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ جس فضیلت کو پانے کے لئے آپ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں میں اس میں پہل کر جاؤں، والسلام"

اُدھر حضرت حسینؓ نے جب خط پڑھا تو فوراً محمد بن حنفیہؒ کے گھر آئے اور انہیں راضی کیا، باہمی رضامندی کا یہ کس قدر انوکھا انداز ہے۔

(رفیق المسلم فی الأسفار، ص: ٣٢)

مجھے ہے حکم اذان لا الہ الا اللہ

ابن ہبیرہ نے خط لکھ کر حضرت حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور امام شعبیؒ کو طلب کیا اور کہا "امیر المومنین یزید نے مجھے ایک ایسا حکم لکھ بھیجا ہے کہ اگر اس پر عملدر آمد کرتا ہوں تو دین وایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اگر عمل نہ کروں تو جان سے جانے کا خوف ہے ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہئے"؟۔ امام ابن سیرینؒ اور امام شعبیؒ نے جواب میں ایسی بات کہی جس میں مصلحت کا لحاظ کیا گیا تھا، لیکن حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا:

> "اے ابن ہبیرہ! اللہ تجھے یزید سے بچا سکتا ہے مگر یزید تجھے اللہ سے نہیں بچا سکتا، اے ابن ہبیرہ! یزید کی اطاعت کرنے میں اللہ سے ڈر اور اللہ کی اطاعت کرنے میں یزید کا خوف مت کر۔" اے ابن ہبیرہ! عنقریب موت کا فرشتہ تجھے تیرے تخت سے اتار کر تیرے محل کی وسعت وکشادگی میں لے جائے گا، پھر تجھے وہاں سے نکال کر تیری قبر کی تنگی وتاریکی میں پہنچا دے گا، اس وقت سوائے تیرے عمل کے کوئی چیز تجھے نجات نہیں دلا سکتی، اے ابن ہبیرہ! خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت کرنا روا نہیں"۔

حضرت حسنؒ کا جواب سن کر ابن ہبیرہ نے ان کے لئے چار ہزار درہم کا حکم دیا جبکہ ابن سیرینؒ اور شعبی کے لئے دو دو ہزار درہم کا حکم دیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم نے ہلکا انداز اختیار کیا، اس لئے ہمیں انعام بھی ہلکا دیا گیا۔

(عیون الأخبار، جلد: ۲، ص: ۳۴۳)

☆☆☆☆

فقر وغنا کی کسوٹی

حضرت ابراھیم بن ادھمؒ سے کسی شخص نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے یہ جبّہ ھدیہ میں قبول فرمائیں...... ابراھیم بن ادھم نے جواب دیا "اگر آپ غنی اور مالدار ہیں پھر تو میں قبول کرلیتا ہوں اور اگر آپ فقیر ہیں تو میں قبول کرنے سے معذرت کرتا ہوں" اس شخص نے کہا، "جی میں غنی ہوں" ابراھیم بن ادھمؒ نے کہا، "آپ کے پاس کتنا مال ہے" اس نے کہا، "دو ہزار" ابراھیم بن ادھمؒ نے کہا "اگر آپ کے پاس چار ہزار ہو جائیں تو آپ کو خوشی ہوگی؟...... اس نے کہا، "جی ہاں کیوں نہیں"...... ابراھیم بن ادھم نے کہا "معلوم ہوا کہ آپ فقیر ہیں، لہذا میں آپ سے ہدیہ قبول نہیں کرتا"۔

(...... ص: ۳۶۲)

اُمیدِ کرم

مبرد نے الکامل میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ جنازہ میں حضرت حسن بصریؒ اور مشہور شاعر فرزدق دونوں حاضر تھے، فرزدق نے حضرت حسنؒ سے کہا، "ابو سعید! معلوم ہے لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آج کے جنازہ میں بہترین اور بدترین دونوں جمع ہوگئے ہیں" بہترین سے حضرت حسنؒ اور بدترین سے فرزدق کی طرف اشارہ تھا، حضرت حسن بصریؒ نے کہا، "نہ میں بہترین ہوں، نہ تم بدترین ہو لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے اس دن کے لئے کیا تیاری کی ہے اور تمہارے پاس اس دن کے لئے کیا زادِ سفر ہے؟" فرزدق نے برجستہ کہا، "شھادة ان لااله الا الله وأن محمّدا رسول الله" وفات کے بعد فرزدق کو خواب میں کسی نے دیکھا، پوچھا، کیا بنا؟ کہا...... "اللہ نے مغفرت فرمادی" دریافت کیا، کس

بنا پر؟ کہا "اس کلمہ طیبہ کی بنیاد پر جس کا میں نے حسن بصریؒ کے ساتھ گفتگو میں حوالہ دیا تھا" کسی نے خوب کہا ہے۔

اک توشۂ امیدِ کرم لے کے چلا ہوں
کچھ اس کے سوا پاس نہیں زادِ سفر اور

(الکامل للمبرد، ج:۱، ص:۱۱۹)

فراست

قاضی ایاس کی فراست و بصیرت ضرب المثل ہے۔ ایک بار قاضی ایاس چند لوگوں کے ساتھ کھڑے تھے کہ کوئی خوفناک واقعہ پیش آیا، تین عورتیں بھی اس جگہ موجود تھیں قاضی ایاس نے کہا "ان تین عورتوں میں سے ایک حاملہ، ایک مرضعہ (دودھ پلانے والی) اور ایک باکرہ (کنواری) ہے" تحقیق کرنے پر ان عورتوں کے متعلق قاضی ایاس کی بات درست نکلی، جب ایاس سے پوچھا گیا کہ آپ کو اس کا اندازہ کیسے ہوا؟ فرمانے لگے "حادثے کے وقت ان عورتوں میں ایک نے ہاتھ پیٹ پر رکھا، میں نے سمجھا حاملہ ہے، دوسری نے پستان پر رکھا، میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ مرضعہ ہے، تیسری نے اپنی شرمگاہ پر ہاتھ رکھا، میں نے اس سے اس کے باکرہ ہونے پر استدلال کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ، خوف اور خطرے کے وقت انسان کو فطری طور پر اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز کی فکر ہوتی ہے اور اسی پر ہاتھ رکھتا ہے"۔

(شرح مقامات للشریشی، ج:۱، ص:۱۸۳)

علامہ ابن خلکان نے قاضی ایاس کی فراست کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے۔ مشہور صحابی حضرت انس بن مالکؓ کی عمر سو سال کے قریب ہو گئی تھی، بھوؤں کے بال سفید

ہو چکے تھے ،لوگ کھڑے رمضان کا چاند دیکھ رہے تھے ،حضرت انسؓ نے فرمایا،''وہ سامنے چاند نظر آ گیا''لوگوں نے دیکھا،کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن حضرت انسؓ افق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ''وہ سامنے مجھے نظر آرہا ہے'' قاضی ایاس نے حضرت انسؓ کی طرف دیکھا، حقیقت سمجھ گئے ،ان کی بھوؤں کا ایک بال آنکھ کی جانب جھک گیا تھا۔ قاضی ایاس نے وہ بال درست کرتے ہوئے پوچھا '' ابو حمزہ ! اب ذرا بتائیں چاند کہاں ہے ؟''...... حضرت انسؓ افق کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے،''اب تو نظر نہیں آرہا''۔

(وفیات الاعیان:جلد،٤ ـص،٣٧٤)

فصلِ گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

ابن جوزی کے پوتے ابو المظفر کہتے ہیں کہ ابن عقیل نے اپنے بارے میں بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ایک مرتبہ جب میں طواف سے فارغ ہو کر نکلا تو میری نظر موتیوں کے ایک ہار پر پڑی جس کے موتی سرخ لڑی میں پروئے ہوئے تھے، میں نے اسے اٹھایا، کچھ دیر کے بعد ایک بوڑھا نابینا شخص ہار تلاش کرتے کرتے اس طرف آ نکلا،وہ ہار لانے والے کے لئے سو دینار انعام کا اعلان بھی کر رہا تھا۔ میں نے ہار اسے واپس کر دیا،اس نے دینار دینا چاہے تو میں نے انکار کر دیا اور شام کی طرف رختِ سفر باندھ کر نکل کھڑا ہوا، یہاں تک کہ بیت المقدس کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی،اب میرا واپس بغداد جانے کا ارادہ تھا مگر زادِ راہ ختم ہو چکا تھا اور بھوک نے بے تاب کر رکھا تھا، چنانچہ میں سردی اور بھوک کی شدت سے نڈھال ہو کر ''حلب'' کی ایک مسجد میں پہنچا تو لوگوں نے مجھے نماز پڑھانے کے لئے آگے کر دیا، نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے مجھے کھانا کھلایا۔چونکہ رمضان کی آمد آمد تھی لوگوں نے کہا، ہمارے امام صاحب انتقال کر گئے ہیں ،لہذا آپ اس مہینے میں ہمیں نمازیں پڑھایئے، میں نے حامی بھر لی، پھر انہوں نے کہا کہ ہمارے امام صاحب کی ایک جوان بیٹی بھی ہے،اس

طرح انہوں نے اس سے میرا نکاح کرادیا۔ ابھی ہمارے نکاح کو ایک سال ہی گذرا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بیٹا عطا فرمایا مگر میری بیوی اس ولادت سے بیمار پڑ گئی، ایک دن میں اس کے پاس پریشان بیٹھا سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک میری نظر اس کے گلے میں پڑے ہار پر جم گئی، یہ بالکل وہی ہار تھا جو مجھے حج سے فراغت کے بعد ملا تھا، میں نے بیوی سے ہار کا سارا قصہ ذکر کیا تو وہ سن کر رونے لگی اور کہنے لگی "بخدا آپ وہی شخص ہیں؟ آپ کے جانے کے بعد میرا باپ رو رو کر یہ دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ! میری بیٹی کو اس ہار لوٹانے والے شخص جیسا نیک شوہر عطا فرما، اللہ نے میرے باپ کی دعا کو کیسے عجیب انداز سے قبولیت بخشی"۔

پھر وہ دنیا سے رخصت ہو گئی اور ابن عقیل اس کا ہار وراثت کے طور پر لے کر یہ کہتے ہوئے بغداد لوٹ آئے کہ فصل گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد!

(سير أعلام النبلاء، ج:١٢، ص:٥٨٦)

بدعت کا ارتکاب ڈاکو بھی نہیں کرتا

مشہور مالکی عالم ابن ماجشون کے پاس ان کا ایک ساتھی آکر کہنے لگا: اے ابو مروان! آج ایک عجیب قصہ پیش آیا، میں جنگل میں واقع اپنے باغ کی طرف جانے کے لئے نکلا کہ اچانک ایک شخص میرے سامنے آدھمکا اور کہنے لگا "اپنے کپڑے اتار دو" میں نے کہا کیوں؟ کہنے لگا "اس لئے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور میں ننگا ہوں" میں نے کہا "یہ کیسی بھائی چارگی ہے؟" کہنے لگا "تم ایک مدت تک ان کپڑوں کو پہن چکے ہو، اب میری باری ہے" میں نے کہا "کیا تم مجھے برہنہ کرنا چاہتے ہو؟" کہنے لگا "ہمیں امام مالکؒ سے روایت پہنچی ہے کہ برہنہ حالت میں غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں اور آپ غسل کرنے جارہے ہیں" میں نے کہا "تم مجھے لوگوں کے سامنے برہنہ کرنا چاہتے ہو" کہنے لگا "اگر یہاں کسی کے آنے کا امکان ہوتا تو میں اس طرح تمہارے گلے نہ پڑتا" میں نے کہا "اچھا مجھے باغ میں تو جانے دو میں

تمہارے لئے کپڑے بھجواتا ہوں" کہنے لگا "ہر گز نہیں، کیا تم اپنے غلاموں کو بھیج کر مجھے گرفتار کروانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا "میں قسم کھاتا ہوں" وہ کہنے لگا تمہاری قسم کسی ڈاکو کے لئے باعث اطمینان نہیں بن سکتی۔ میں نے قسم کھا کر کہا کہ میں ضرور بھیجوں گا، اور اپنی خوشی سے بھیجوں گا، وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "میں نے عہد رسالت سے لے کر آج تک کے ڈاکوؤں کے بارے میں بڑی سوچ بچار کی مگر مجھے ایسا کوئی ڈاکو نہیں ملا جس نے ادھار کا معاملہ کیا ہو لہذا میں نہیں چاہتا کہ میں اس بدعت کا ارتکاب کروں"...... اس کی یہ دلیل سن کر بادل نخواستہ میں نے کپڑے اتار کر اس کے حوالے کر دیئے۔

(سیر اعلام النبلاء، ج:۱۱، ص:۵۲۱)

تلخ نوائی مری چمن میں گوارا کر

مشہور عباسی خلیفہ منصور ایک رات طواف کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کان میں آواز پڑی "اے اللہ! میں تیری ہی بارگاہ میں ظلم وزیادتی کے عام ہونے، حق اور اہل حق کے درمیان حرص وطمع کے داخل ہونے کا شکوہ کرتا ہوں"...... یہ سن کر خلیفہ منصور وہاں سے نکل کر مسجد کے ایک کونے میں آکر بیٹھ گیا اور خادم کو حکم دیا کہ اس شخص کو میرے پاس حاضر کرو، اس شخص کو جب خلیفہ کا پیغام ملا تو اس نے دو رکعت نماز پڑھ کر استیلام رکن کیا اور خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ خلیفہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "یہ ہم نے تمہیں کیا کہتے سنا کہ "زمین میں ظلم وزیادتی عام ہو گئی ہے اور حق اور اہل حق کے درمیان حرص وطمع داخل ہو گئی"...... بخدا تمہاری اس بات سے ہمیں بڑی تکلیف ہوئی" اس شخص نے کہا "اے امیر المومنین! اگر جان کی امان پاؤں تو حقیقت حال عرض کروں؟" خلیفہ نے کہا، "ہم نے تمہیں امان دی" وہ شخص کہنے لگا:

"اے امیر المومنین! خود آپ ہی کی ذات حرص وطمع اور دنیوی لالچ کا شکار ہو گئی ہے، حرص وطمع کے اس مکروہ جذبے نے آپ کو ظلم

وزیادتی کا سد باب کرنے سے روکے رکھا ہے۔ خلیفہ نے کہا ”تیرا برا ہو، میرے اندر لالچ اور حرص کیونکر داخل ہو سکتی ہے جب کہ میں سیاہ و سفید کا مالک ہوں اور سونا و چاندی میری مٹھی میں ہے؟“ اس شخص نے کہا ”آپ جس طرح دنیوی اغراض و مفادات کا شکار ہوئے ہیں اس طرح کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے کندھے پر مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ڈالی ہے مگر آپ اس کی انجام دہی سے غفلت برت رہے ہیں اور مال و دولت جمع کرنے میں مگن ہیں، آپ نے چونے اور پکی اینٹوں کی دیواریں کھڑی کر کے، مضبوط آہنی دروازے لگا کر، مسلح پہرے دار اور دربان بٹھا کر مظلوموں پر اپنے دربار تک رسائی کی تمام راہیں مسدود کر دی ہیں، لوگوں سے ٹیکسوں کی شکل میں مال و دولت سمیٹنے کے لئے اپنے عمال کو کیل کانٹے سے لیس کر کے روانہ کر رکھا ہے، آپ کی رعایا میں سے صرف مخصوص طبقے کو ہی دربار شاہی میں شرف باریابی کا پروانہ حاصل ہے، کمزوروں، غریبوں اور ستم رسیدہ لوگوں کے لئے آپ کے دروازے بند ہیں۔ یہ طبقہ اشرافیہ جسے آپ کا تقرّب حاصل ہے اور جسے دربار میں بلا روک ٹوک رسائی حاصل ہے، جب آپ کو مال و دولت تقسیم کرنے کی بجائے دونوں ہاتھوں سے سمیٹتے دیکھتا ہے تو اسے وجہ جواز بنا کر خود اس بندر بانٹ کے ارتکاب پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر لوگوں کے احوال کی صحیح خبر آپ تک پہنچنے نہ پائے۔ اگر اقتدار میں موجود کوئی نیک بندہ اس طبقے کی غلط روش کی مخالفت کرے تو اس پر الزام تراشیاں اور دشنام طرازیاں کر کے ذلیل و رسوا کرنے کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا جاتا اور جب وہ راہ سے ہٹ جاتا ہے

تولوگ اس طبقے کی ہیبت اور اثر ورسوخ سے مزید مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس سے نباہ رکھنے کے لئے مال ودولت اور ھدایا کا سہارا لیتے ہیں، اس طرح اس طبقہ کے لوگ رعایا پر ظلم کرنے میں پہلے سے زیادہ مستعد ہو جاتے ہیں، یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اثر ورسوخ اور جاہ ومرتبہ کے مالک ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ شہر، ظلم وزیادتی اور فساد کی آماجگاہ بن گئے ہیں، طبقہ اشرافیہ کے افراد عملاً آپ کی سلطنت میں شریک ہوگئے ہیں، جب کہ آپ اس ساری صورتحال سے بے پرواہ ہیں، جب کوئی مظلوم ظلم کی شکایت لے کر آپ کے دربار میں آنا چاہتا ہے تو اس کی راہ روکی جاتی ہے اور اگر آپ کے باہر آنے پر اپنا مقدمہ آپ کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کرے تو آپ کا اتنا کہدینا اسے مایوسی کے غار میں دھکیلنے کے لئے کافی ہے کہ "یہ وقت فریاد سننے کا نہیں" اسی طرح اگر آپ ظالموں کے احتساب کے لئے کوئی محتسب مقرر کریں اور مقربین کو خبر ہو جائے تو وہ اسے مجبور کرتے ہیں کہ ان کی شکایات آپ تک نہ پہنچائے، وہ بے چارہ ان کے خوف سے زبان بند رکھتا ہے اور یوں مظلوم شخص شکوۂ ظلم لئے اس کے یہاں چکر پہ چکر لگاتا ہے مگر کچھ شنوائی نہیں ہوتی، آخر کار جب ہر طرف سے تنگ آکر وہ آپ کے نکلنے پر بے اختیار تڑپ کر فریاد کرتا ہے تو اسے اذیت ناک سزا دیکر دوسروں کے لئے نمونۂ عبرت بنادیا جاتا ہے، یہ سب کچھ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے مگر آپ کی پیشانی پر بل تک نہیں آتا، کیا یہی اسلام ہے؟؟؟

امیر المومنین! میرا ملک چین آنا جانا رہتا تھا، ایک مرتبہ میں وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ کی قوت سماعت جواب دے گئی ہے اور وہ کانوں سے بہرہ ہو گیا ہے، اس دن بادشاہ نے بھری مجلس میں

دہاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا، اہل مجلس اس مصیبت پر صبر کی تلقین کرنے لگے تو اس نے سر اٹھایا اور کہا "میرا رونا اس لئے نہیں کہ مجھ پر مصیبت پڑی ہے، میں تو اس مظلوم کے غم میں رو رہا ہوں جو ظالم کے خلاف فریاد لیکر میرے در پر دستک دے گا مگر میں سن نہ پاؤں گا" کچھ دیر ٹھہر کر کہنے لگا "خیر ......اگر سماعت چلی گئی مگر آنکھیں تو سلامت ہیں، جاؤ، رعایا میں اعلان کرا دو کہ آج کے بعد ملک میں مظلوم فریادی کے سوا کوئی سرخ کپڑے نہ پہنے تاکہ مظلوم کے سرخ کپڑے دیکھ کر میں اس کی دادرسی کر سکوں" پھر وہ ہاتھی پر سوار ہو کر نکل کھڑا ہوتا اور مظلوموں کی دادرسی کرتا۔

امیر المومنین! اس بادشاہ نے مشرک ہونے کے باوجود اپنی قوم کے ساتھ ہمدردی کو ذاتی مفاد پر مقدم رکھا اور ایک آپ ہیں کہ خدائے واحد پر ایمان رکھنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کا فرد ہونے کے باوجود اپنی خواہش نفس کو مسلمان رعایا کی خیر خواہی پر قربان نہیں کر سکتے، اگر تو آپ مال و دولت اپنے بیٹے کے لئے جمع کر رہے ہیں تو دنیا میں جو بچہ بھی آتا ہے اس کا کوئی مال و متاع نہیں ہوتا مگر خدائے بزرگ و برتر کا سایۂ عاطفت مسلسل اس پر دراز ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس بچے کی عظمت کے گن گانے لگتے ہیں، آپ کسی کو کچھ نہیں دے سکتے اور اللہ جس کو جو چاہے عطا فرماتا ہے اور اگر مال و دولت جمع کرنے سے آپ کا مقصد سلطنت کی مضبوطی اور استحکام ہے تو بنو امیہ کی مثال اور تاریخ آپ کے سامنے ہے کہ ان کا جمع کردہ لاؤ لشکر اور مال و دولت ان کے کسی کام نہ آیا، اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ جیسا معاملہ کرنا چاہے گا، اسے کوئی روک نہیں سکتا اور نہ ہی مال و دولت کے انبار لگا کر آپ اپنے موجودہ رتبے

سے بلند کوئی مرتبہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اے امیر المومنین! کیا اپنی نافرمانی کرنے والے کو آپ قتل سے بڑھ کر کوئی سزا دے سکتے ہیں؟ خلیفہ نے کہا "نہیں" اس شخص نے کہا تو پھر آپ کا اس بادشاہ کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے آپ کو دنیا کی بادشاہت سے سرفراز فرمایا اور وہ اپنے نافرمان کو قتل نہیں بلکہ دائمی دردناک عذاب کی سزا دیتا ہے، وہ بخوبی واقف ہے کہ کس چیز کی محبت میں آپ کا دل جکڑا ہوا ہے اور وہ کیا چیز ہے جو آپ کا مطمح نظر قرار پائی ہے کہ اسی کے حصول کے لئے آپ کے ہاتھ بڑھتے اور قدم اٹھتے ہیں، دنیا کی جس بادشاہت پر آپ فریفتہ ہیں، کیا وہ اس وقت آپ کے کام آسکے گی جب وہ قادر مطلق ذات اسے آپ سے چھین لے گی اور آپ کو حساب کے لئے لا کھڑا کرے گی۔

اس شخص کی باتیں سن کر خوف آخرت سے خلیفہ منصور کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی، بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتا" پھر اس شخص سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، "اچھا اب تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ کہ میں کیا کروں"...... وہ شخص کہنے لگا "اے امیر المومنین! دنیا میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی طرف لوگ اپنے دینی معاملات میں رجوع کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، آپ بھی ایسے ہی لوگوں کو اپنا مقرب بنایئے، وہ آپ کی درست رہنمائی کریں گے، اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لیجئے، وہ آپ کو لغزش سے بچائیں گے" خلیفہ نے کہا، "میں نے اس کی کوشش کی تھی مگر وہ مجھ سے دور بھاگتے ہیں" اس شخص نے کہا، "انہیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں آپ انہیں اپنی راہ پر چلنے کے لئے مجبور نہ کریں، آپ اپنے دروازے کھلے رکھیں، رکاوٹیں

ہٹادیں، مظلوم کے ساتھ انصاف اور ظلم کا خاتمہ کریں، غنیمت اور صدقات کا مال وصول کر کے ضرورت مند اور مستحقین میں عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کریں تو میں آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ وہ ہستیاں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر امت کی فلاح وبہبود کے لئے آپ کے ساتھ تعاون کریں گی......

گفتگو جاری تھی کہ اس دوران مؤذن نے آکر سلام کیا اور اذان دی، خلیفہ منصور نماز پڑھ کر اپنی مجلس میں چلا آیا اور اس شخص کو بلانے کے لئے آدمی بھیجا تو تلاش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

(عیون الأخبار، جلد: ۲، ص: ۳۳۳)

ایثار وہمدردی کا ایک انوکھا واقعہ

ایثار وہمدردی یعنی دوسرے کو اپنے اوپر ترجیح دینا اور دوسرے کے غم اور دکھ درد میں شریک ہونا اسلام کی معاشرتی تعلیمات میں سے ہے، معاشرہ کے اجتماعی نظام کے استحکام اور بقاء میں اس کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، اسلامی معاشرہ کی تاریخ میں اسلام کی تعلیم ایثار وہمدردی کے بڑے عجیب واقعات ملتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو خطیب بغدادیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "تاریخ بغداد" میں امام واقدی کے حالات میں لکھا ہے:

واقدی کا بیان ہے کہا ایک مرتبہ مجھے بڑی مالی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، فاقوں تک نوبت پہنچی، گھر سے اطلاع آئی کہ عید کی آمد آمد ہے اور گھر میں کچھ نہیں، بڑے تو صبر کر لیں گے، لیکن بچے مفلسی کی عید کیسے گذاریں گے؟ یہ سن کر میں اپنے ایک تاجر دوست کے پاس قرض لینے گیا، وہ مجھے دیکھتے ہی سمجھ گیا اور بارہ سو درہم کی سر بمہر ایک تھیلی میرے ہاتھ تھما دی، میں گھر آیا، ابھی بیٹھا ہی تھا کہ میرا ایک ہاشمی دوست آیا، اس کے گھر بھی افلاس

وغربت نے ڈیرہ ڈالا تھا، وہ قرض رقم چاہتا تھا، میں نے گھر جا کر اہلیہ کو قصہ سنایا، کہنے لگی، ”کتنی رقم دینے کا ارادہ ہے؟“ میں نے کہا، ”تھیلی کی رقم نصف نصف تقسیم کر لیں گے، اس طرح دونوں کا کام چل جائے گا“ کہنے لگی، ”بڑی عجیب بات ہے، آپ ایک عام آدمی کے پاس گئے، اس نے آپ کو بارہ سو درہم دیئے اور آپ اسے ایک عام آدمی کے عطیہ کا نصف دے رہے ہیں، آپ اسے پوری تھیلی دیدیں“ چنانچہ میں نے وہ تھیلی کھولے بغیر سر بمہر اس کے حوالہ کر دی، وہ تھیلی لے کر گھر پہنچا تو میرا تاجر دوست اس کے پاس گیا، کہا، ”عید کی آمد آمد ہے، گھر میں کچھ نہیں، کچھ رقم قرض چاہیے“ ہاشمی دوست نے وہی تھیلی سر بمہر اس کے حوالہ کر دی، اپنی ہی تھیلی اسی طرح سر بمہر دیکھ کر اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ وہ تھیلی ہاشمی دوست کے ہاں چھوڑ کر میرے پاس آیا، میں نے اسے پورا قصہ سنایا، در حقیقت تاجر دوست کے پاس بھی اس تھیلی کے علاوہ کچھ نہیں تھا وہ سارا مجھے دے گیا تھا، اور خود قرض لینے ہاشمی کے پاس چلا، ہاشمی نے جب وہ حوالہ کرنا چاہا تو راز کھل گیا۔

ایثار وہمدردی کے اس انوکھے واقعہ کی اطلاع جب وزیر یحیٰ بن خالد کے پاس پہنچی تو وہ دس ہزار دینار لے کر آئے، کہنے لگے، ”ان میں دو ہزار آپ کے، دو ہزار آپ کے ہاشمی دوست کے، دو ہزار تاجر دوست کے اور چار ہزار آپ کی اہلیہ کے ہیں کیونکہ وہ تو سب میں زیادہ قابل قدر اور لائق اعزاز ہے۔

(تاریخ بغداد، ج:۳، ص:۲)

﴿ویو ثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصة......﴾ یہ تھے وہ لوگ جن میں اسلام کی اخلاقی قدریں آباد تھیں اور جنہیں دیکھ کر غیر مسلم، اسلام قبول کرنے پر خود بخود آمادہ ہو جاتے تھے، اب ڈھونڈ، انہیں چراغ رخ زیبا لے کر!

☆☆☆☆

بسم اللہ کی تاثیر

بادشاہِ روم قیصر نے حضرت عمر فاروقؓ کی طرف ایک خط میں لکھا کہ میرے سر میں درد رہتا ہے، کوئی علاج بتائیں، حضرت عمرؓ نے اس کے پاس اپنی ٹوپی بھیجی کہ اسے سر پر رکھا کرو، سر کا درد جاتا رہے گا، چنانچہ قیصر جب وہ ٹوپی سر پر رکھتا تو درد ختم ہو جاتا، اتارتا تو درد دوبارہ لوٹ آتا، اسے بڑا تعجب ہوا، تجسس سے ٹوپی چیری تو اس کے اندر ایک رقعہ پایا جس پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا تھا۔ یہ بات قیصر کے دل میں گھر کر گئی، کہنے لگا "دین اسلام کس قدر معزز ہے اس کی تو ایک آیت بھی باعث شفا ہے، پورا دین باعث نجات کیوں نہ ہوگا" اور اسلام قبول کر لیا۔

(المواهب اللدنيه شرح شمائل ترمذی، ص:۳)

"بسم اللہ" کی تاثیر کا ایک اور واقعہ امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر ایک قبر پر ہوا جس میں میت کو عذاب دیا جا رہا تھا، دوبارہ وہاں سے گذر ہوا تو دیکھا کہ قبر میں رحمت کے فرشتے ہیں، عذاب کی تاریکی کی بجائے وہاں اب مغفرت کا نور ہے، آپ کو تعجب ہو، اللہ تعالیٰ سے اس عقدہ کو حل کرنے کی دعا کی تو اللہ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ "یہ بندہ گنہگار تھا، جس کی وجہ سے مبتلائے عذاب تھا، مرتے وقت اس کی بیوی امید سے تھی، اس کا بچہ پیدا ہوا، وہ بچہ مکتب میں داخل کر دیا گیا، استاذ نے اسے پہلے دن "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھائی، تب مجھے اپنے بندے سے حیا آئی کہ میں زمین کے اندر اسے عذاب دیتا رہوں جبکہ اس کا بیٹا زمین کے اوپر میرا نام لیتا ہے"۔

(تفسیر کبیر ج ا ص ۱۷۲)

☆☆☆☆

خوگرِ صدق وصفا

مشہور اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی رائے یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ پر العیاذ باللہ تہمت لگانے والوں میں سب سے بڑا کردار حضرت علیؓ کا تھا، ہشام کے پاس ایک مرتبہ مشہور محدث سلیمان بن یسار آئے، ہشام نے ان سے پوچھا "سلیمان! ذرا بتاؤ کہ قرآن کریم کی آیت ﴿والذی تولی کبرہ﴾ کا مصداق کون ہے؟" سلیمان نے کہا "عبداللہ بن ابی" ہشام نے جھٹ سے کہا "جھوٹ" اس کا مصداق "علیؓ" ہیں۔ سلیمان نے عرض کیا "امیر المؤمنین اعلم بما یقول" (امیر المؤمنین اپنی بات کا زیادہ جاننے والا ہے) اتنے میں امام زہری آگئے، ہشام نے ان سے بھی یہی سوال کیا" یا ابن شهاب! من الذی تولی کبرہ"؟ زہریؒ نے فرمایا، "عبداللہ بن ابی" ہشام نے کہا 'کذبت" (تونے جھوٹ بولا) اس کا مصداق علی ہیں، امام زہری نے جواب دیا، اور کیا ہی اچھا جواب دیا، فرمایا:

أنا اکذب، لا أبالك، واللہ لو نادی مناد من السماء

إن اللہ أحل الکذب، ماکذبت

"ارے تیرا ناس ہو! میں جھوٹ بول رہا ہوں، خدا کی قسم!
اگر کوئی پکارنے والا آسمان سے پکار اٹھے کہ اللہ نے جھوٹ بولنا حلال
کردیا ہے تب بھی میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

(فتح الباری: ج:۷ ص:۳۳۷)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

ابو معلق نامی ایک صحابی تجارت کی غرض سے اکثر سفر پر رہتے تھے، ایک بار مال تجارت لے کر جارہے تھے کہ راستے میں ایک ڈاکو نے آلیا، کہا "تمھارا مال اور جان دونوں لینا چاہتا ہوں" فرمانے لگے "میری جان لے کر کیا کروگے، مال حاضر ہے، مجھے چھوڑ دو" لیکن وہ

نہ مانا، کہا "تمہیں بھی قتل کرنا ہے" فرمایا "تو مجھے چار رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دے دو" ڈاکو نے مہلت دیدی، صحابی نے چار رکعت نماز ادا کی اور آخری سجدے میں یہ دعا مانگی، ایک پریشان حال کی دعا جو دل سے نکلی اور افلاک کو چیرتی چلی گئی:

یاودود، یا ودود، یا ذا العرش المجید، یا فعال لما یرید، أسألك بعزك الذی لایرام، وبملكك الذی لایضام، وبنورك الذی مَلأ أركان عرشك: أن تكفینی شر هذا اللص، یامغیث، أغثنی! یا مغیث، أغثنی! یا مغیث، أغثنی!

"اے محبت کرنے والے، اے محبت کرنے والے، اے بزرگ عرش والے، اے اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے والے، میں تجھ سے تیری اس عزت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جس کا ارادہ نہیں کیا جاسکتا اور اس ملک وبادشاہت کا وسیلہ دے کر سوال کرتا ہوں جس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اور تیرے اس نور کے ذریعے سے سوال کرتا ہوں جس نے تیرے عرش کے ارکان کو روشن کیا ہے کہ تو مجھ کو اس ڈاکو کی برائی سے بچالے، اے مدد کرنے والے! میری مدد فرما، اے مدد کرنے والے میری مدد فرما، اے مدد کرنے والے میری مدد فرما"۔

اتنے میں ہاتھ میں نیزہ لیے ایک شہسوار نمودار ہوا۔ اس نے ڈاکو کو قتل کر کے سر بسجود صحابی سے کہا کہ سر اٹھالیں، صحابی نے سر اٹھا کر جو دیکھا کہ ڈاکو مرا پڑا ہے تو پوچھا "آپ کون؟" کہنے لگا "میں چوتھے آسمان کا فرشتہ ہوں، تم نے پہلی مرتبہ دعا کی تو میں نے آسمان کے دروازوں کے کھلنے کی آواز سنی، دوسری بار دعا کی تو میں نے اہل سماء میں ہلچل کی آواز سنی، تیسری مرتبہ دعا کی تو مجھ سے کہا گیا کہ یہ ایک مصیبت زدہ کی فریاد ہے، میں نے اللہ سے ظالم کے قتل کرنے کی درخواست کی جو منظور ہوئی، چنانچہ میں نے آکر اس کو قتل کردیا"۔

(الجواب الكافی لمن سأل عن الدواء الشافی، ص:۱۲)

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لیے

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں بھی اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ دمشق میں ایک آدمی اپنا گدھا سواری کے لیے اجرت پر دے کر گذر بسر کرتا تھا، ایک دن ایک شخص نے آکر کہا کہ فلاں جگہ جانا ہے، مجھے لے چلو، اس نے اس شخص کو بٹھا کر چلنا شروع کیا تو وہ ایک ویران راستہ سے جانے کے لیے کہنے لگا، گدھے کے مالک نے کہا کہ یہ راستہ مجھے نہیں معلوم، وہ شخص کہنے لگا "مجھے معلوم ہے، یہ راستہ قریب پڑتا ہے" جب اس راستے سے کچھ آگے بڑھے تو ایک خطرناک وادی آئی، وہ شخص گدھے سے اترا اور خنجر نکال کر سواری کے مالک کو اس نے قتل کرنے کا ارادہ کیا، اس بیچارے نے اللہ کا واسطہ دے کر کہا کہ گدھا اور اس پر جو کچھ ہے سب لے لو مجھے چھوڑ دو لیکن وہ نہیں مانا، کہا کہ وہ تو لینا ہی ہے مگر تم کو بھی قتل کروں گا، اس نے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت مانگی، کہا "جلدی پڑھو" سواری کے مالک کا بیان ہے کہ میں نماز کے لیے کھڑا ہوا تو خوف کی وجہ سے جو کچھ یاد تھا سب بھول گیا، قرآن کا ایک حرف بھی حافظہ میں نہیں رہا، اچانک میری زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت جاری فرمائی ﴿أمن يجيب المضطر إذا دعاه ويكشف السوء﴾ (کوئی ہے جو پریشان حال لوگوں کی دعاؤں کو سنتا ہے اور ان کی تکلیف کو دور کرتا ہے) اتنے میں ایک شہسوار آیا، اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا، وہ نیزہ اس نے اس ڈاکو کے سینے میں دے مارا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا، میں نے شہسوار سے اس کا تعارف پوچھا تو وہ کہنے لگا "میں اسی ذات کا بندہ ہوں جو پریشان حال کی دعا سنتی اور مصیبت دور کرتی ہے"۔

(تفسیر ابن کثیر، ج:۳ ص:۳۷۱)

واقعتاً اللہ تعالیٰ مظلوم کی دعا جلد قبول فرماتے ہیں، مصیبت زدہ اور مظلوم کی آہ جب بلند ہوتی ہے تو اس کی قبولیت میں دیر نہیں لگتی ۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلو! ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لیے

استغفار کی برکات

حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں ایک شخص نے آکر قحط سالی کی شکایت کی تو انھوں نے اس سے فرمایا "استغفار کرو" یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرو، دوسرے شخص نے غربت وافلاس کی شکایت کی تو اس سے فرمایا "استغفار کرو" تیسرا ایک آدمی آیا، اس نے نرینہ اولاد کے لیے دعا کی درخواست کی، فرمایا "استغفار کرو" چوتھے شخص نے آکر اپنے باغ کے خشک ہو جانے کا ذکر کیا تو آپ نے اس سے بھی فرمایا" استغفار کرو"۔

ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے پاس چار آدمی الگ الگ شکایت لے کر آئے اور آپ نے سب کو استغفار کا حکم دیا، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا، "میں نے اپنی طرف سے تو کوئی بات نہیں بتلائی، خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ نوح میں ارشاد فرمایا ہے ﴿استغفرو ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمددکم باموال وبنین ویجعل لکم جنت ویجعل لکم انہارا﴾ یعنی اپنے رب سے گناہوں کی معافی طلب کرو، بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے، آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش برسائے گا، تمھارے اموال اور بیٹوں میں اضافہ کرے گا اور تمھارے لیے باغ اور نہریں بنائے گا"۔

(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی، ج:۱۸، ص:۳۰۲)

ان آیات مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے موسلا دھار بارش، مال واولاد میں اضافہ اور باغات ونہروں کی فراوانی کی نعمتوں کو استغفار کے نتیجے کے طور پر ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کی کثرت ان نعمتوں کی وصولیابی کا سبب بنتی ہے، حضرت حسن بصریؒ نے اسی لیے مختلف شکایتوں والے چاروں اشخاص کو استغفار کا حکم دیا۔

امام قرطبیؒ نے ان آیات کے تحت امام شعبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ استسقاء یعنی بارش طلب کرنے کے لیے شہر سے نکلے اور صلاۃ استسقاء کی بجائے

صرف استغفار پڑھ کر واپس آئے اور بارش ہو گئی، لوگوں نے پوچھا "آپ نے بارش کے لیے دعا نہیں کی، صرف استغفار کیا تھا" آپ نے فرمایا "میں نے تو زبردست موسلا دھار برسنے والے بادلوں کو مانگا تھا" اور پھر یہ آیت پڑھی ﴿استغفروا ربکم انه کان غفارا، یرسل السماء علیکم مدرارا﴾

چشمِ خطا پوش

ایک شخص نے فضل بن ربیع کے نام کا جعلی خط تحریر کیا، جس میں اپنے لئے ایک ہزار دینار کا حکم جاری کر کے دستخط کئے گئے تھے، وہ شخص خط لے کر فضل بن ربیع کے خزانچی کے پاس پہنچا، اس نے خط پڑھ ڈالا مگر اسے کوئی شبہ نہ گزرا، وہ ایک ہزار دینار، اس کے سپرد کرنے ہی لگا تھا کہ اس دوران فضل بن ربیع کسی کام سے خود وہاں آ پہنچا، خزانچی نے اس شخص کا تذکرہ اس کے سامنے کیا اور خط بھی دکھا دیا، فضل بن ربیع نے خط دیکھنے کے بعد ایک نظر اس شخص کے چہرے پر ڈالی تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا، فضل بن ربیع سر جھکا کر کچھ دیر سوچنے کے بعد خزانچی سے مخاطب ہوا "تمہیں معلوم ہے میں اس وقت تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟" خزانچی نے نفی میں گردن ہلا دی، فضل بن ربیع نے کہا، "میں تمہیں صرف یہ تاکید کرنے آیا ہوں کہ اس شخص کو رقم فوراً ادا کر کے اس کی ضرورت پوری کرو" خزانچی نے فوراً ہزار دینار تھیلی میں ڈال کر اس شخص کے سپرد کر دیئے، وہ شخص ہکا بکا رہ گیا، گھبراہٹ کے عالم میں کبھی تو وہ فضل بن ربیع کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی خزانچی کے، فضل بن ربیع قریب ہو کر اس سے مخاطب ہوا "گھبراؤ نہیں اور راضی خوشی گھر کا رخ کرو" اس شخص نے فرط جذبات سے فضل بن ربیع کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور کہا، "آپ نے میری پردہ پوشی کی اور رسوا نہ کیا، روز قیامت اللہ آپ کی پردہ پوشی فرمائے اور رسوائی سے بچائے" یہ کہہ کر اس نے دینار لئے اور نکل آیا۔

(المستطرف ص:۲۰۶)

ایک آشیانے کے لیے

مشہور صحابی حضرت عمرو بن عاصؓ نے مصر کو فتح کرنے کے لیے وہاں کے ایک قلعے کے سامنے ایک بڑا خیمہ نصب کیا تھا، پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو اس خیمے کو اکھاڑ کر ساتھ لے جانا چاہا لیکن جب اکھاڑنے کے لیے آگے بڑھے تو دیکھا کہ خیمے کے اوپر کی جانب ایک کبوتری نے انڈے دے رکھے ہیں اور ان پر بیٹھی ہے، خیمہ اکھاڑنے سے یہ انڈے ضائع ہو جاتے ہیں، حضرت عمرو بن عاصؓ نے فرمایا کہ اس کبوتری نے ہمارے خیمہ میں پناہ لی ہے، اس لئے اس خیمے کو اس وقت تک باقی رکھو جب تک یہ بچے پیدا ہو کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں، چنانچہ خیمہ باقی رکھا گیا۔

(جہان دیدہ، ص:۱۴۰)

میر کارواں ہو تو ایسا

مشہور بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے وفات سے پہلے یہ وصیت فرمائی کہ ان کی نماز جنازہ ایسا شخص پڑھائے جو ہمیشہ عفیف رہا ہو، نماز عصر کی سنتیں اس سے قضا نہ ہوئی ہوں اور ہمیشہ نماز باجماعت میں تکبیر اولی سے شریک رہا ہو، نماز جنازہ کے وقت جب اس وصیت کا اعلان کیا گیا تو مشہور بادشاہ سلطان التمش نے بھی اس کو سنا، وہ تھوڑی دیر خاموش رہا کہ کسی بزرگ کو یہ سعادت حاصل ہو، لیکن جب کسی نے امامت کے لیے سبقت نہیں کی تو وہ یہ کہتا ہوا آگے بڑھا کہ میری خواہش تو یہی تھی کہ میرے حال سے کوئی واقف نہ ہو لیکن خواجہ کے حکم کے آگے کوئی چارہ نہیں اور آگے بڑھ کر جنازہ کی نماز پڑھائی۔

(بزم رفتہ کی سچی کہانیاں ج:۱، ص:۴۹)

غیرت مند ہاتھی

بادشاہ بہادر شاہ ظفر خاندان مغلیہ کے آخری بادشاہ تھے،ان کی عمر کا آخری حصہ بڑا دردناک رہا، انگریزوں نے انہیں گرفتار کیا،ان کے سامنے ان کے عزیز قتل کیے گئے، انہیں قید وبند کی تاریکیوں اور صعوبتوں میں پھینک ڈالا، وہ اُردو کے اچھے شاعر بھی تھے، انہوں نے قید وبند کے عرصہ میں بڑی دردناک غزلیں کہی ہیں،ان کے دکھ بھرے اشعار کا نمونہ ملاحظہ ہو، سنا ہے یہ اشعار ان کی لوح تربت پر بھی ثبت ہیں

میرا رنگ و روپ بگڑ گیا میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
میری فاتحہ کے لئے کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

ان کے داروغہ ماہی مراتب حضرت ظہیر دہلوی نے اپنی آپ بیتی...... "داستان غدر" کے نام سے لکھی ہے، اس میں انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے مشہور ہاتھی "مولا بخش" کا یہ حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے کہ:

"مولا بخش ایک قدیم معمر ہاتھی تھا، اُس نے کئی بادشاہوں کو سواری دی تھی، اس ہاتھی کی عادتیں بالکل انسان کی تھیں، قدو قامت میں ایسا بلند و بالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین میں نہ تھا اور نہ اب ہے، یہ ہاتھی بیٹھا ہوا اور ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ خوب صورتی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، کسی آدمی کو سوائے ایک خدمتی کے پاس نہ آنے دیتا تھا، جس دن بادشاہ کی سواری ہوتی تھی اُس سے ایک دن پیشتر شاہی چوب دار جاکر حکم سُنا دیتا تھا کہ "میاں

مولا بخش! کل تمھاری نوکری ہے، ہوشیار ہو جاؤ، نہادھو کر تیار رہو" بس اُس وقت سے ہوشیار ہیں۔ جس وقت ہوادار سواری میں بادشاہ نقار خانے کے دروازے سے برآمد ہوتے، چیخ مار کر تین سلام کیے اور خود ہی بیٹھ گیا، جس وقت تک بادشاہ سوار نہ ہو لیں اور خواص نہ بیٹھ جائیں، کیا مجال کہ جنبش کر جائے، جب بادشاہ سوار ہو لیے اور فوج دار نے اشارہ کیا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ مختصر یہ کہ جب سواری سے فرصت پائی، پھر ویسا ہی مست ہے جیسا تھا، یہ کمال اس ہاتھی کو حاصل تھا۔ جب فیل خانۂ شاہی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مولا بخش نے دانہ پانی چھوڑ دیا۔ فیل بان نے جا کر سانڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ سانڈرس صاحب کو یقین نہ آیا، فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلوائیں گے، وہ پانچ روپے کے لڈو اور کچوریاں ہمراہ لے کر ہاتھی کے تھان پر پہنچے اور شیرینی کا ٹوکرا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا، ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرے کو اس طرح کھینچ مارا کہ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا، ٹوکرا دُور جا گرا اور تمام شیرینی بکھر گئی، سانڈرس بولے "ہاتھی باغی ہے، اسے نیلام کر دو"۔ چنانچہ اُسی روز صدر بازار میں لا کر کھڑا کیا اور نیلام کی بولی بولی، کوئی خریدار نہ ہوا۔ ایک پنساری نے ڈھائی سو روپے کی بولی دی، اسی بولی پر صاحب نے نیلام ختم کر دیا، فیل بان نے ہاتھی سے کہا کہ

"لے بھائی! تمام عمر تو تو نے بادشاہوں کی نوکری کی، اب
تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا"

یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے زمین پر گر پڑا اور جان بحق ہو گیا۔

(کتابیں ہیں چمن اپنا، ص: ۱۶۲...... ۱۶۴)

جن سے عجیب فرمائش

مولانا کوثر نیازی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا جنّات کے بارے میں ایک ذاتی مشاہدہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مفتی صاحب نے فرمایا:

"ایک زمانے میں خود میری بیوی پر جن مسلط ہو گیا، میں نے اس سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ وہ مسلمان ہے، میں نے اس سے ثبوت چاہا کہ وہ واقعی جن ہے تو اس نے کہا کہ آپ کچھ فرمائش کر کے دیکھ لیں، میں نے عجیب فرمائش کی کہ الائچی کے درخت سے ایک ایسی سبز ٹہنی لے کر آؤ جس پر سبز الائچی لگی ہو۔ اب یہ درخت ہمارے ہاں تو ہے نہیں، میں نے سوچا کہاں سے لائے گا، تھوڑی ہی دیر میں سبز شاخ پر سبز الائچی میری گود میں تھی۔ اَب میں نے اس کی مسلمانی کا امتحان لیا، میری بیوی عربی نہیں جانتی تھی، میں نے کہا "قصیدہ بردہ" کے کچھ عربی اشعار سناؤ، اس نے فر فر پورا قصیدہ سنانا شروع کر دیا۔

(جنہیں میں نے دیکھا: ص، ۲۵۵)

☆☆☆☆

احسان دانش اردو کے ممتاز شاعر ہیں، مزدوروں اور غریبوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی جیسی سوز و گداز سے بھرپور تصویریں انھوں نے کھینچی ہیں، اس کی مثال نام نہاد ترقی پسند حلقے کے بڑے سے بڑے شاعر کے ہاں بھی نہیں ملتی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ڈرائنگ روم کی شاعری نہیں، ان کی زندگی کا ایک طویل اور بہترین حصہ مزدوری میں گزرا، بہت سے لوگوں کو حیرت ہو گی کہ احسان دانش کی تعلیم پانچویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکی تھی، پنجاب یونیورسٹی کی تعمیر میں انھوں نے مزدوری کرتے ہوئے وہ کام

کیا جو اس زمانے میں بیل یا کسی جانور سے لیا جاتا، لیکن مسلسل مطالعہ اور اپنی علمی جدوجہد سے بعد میں اسی یونیورسٹی کے امتحانات کے نگران مقرر ہوئے اور اب تک ان کی نظموں کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، ان کا یہ شعر تو بہت مشہور ہے اور آج بھی کسی جواں مرگ کی لوح تربت پر لکھا نظر آتا ہے:

یہ پھول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکا
کھلا ضرور مگر کھل کے مسکرا نہ سکا

انھوں نے اپنی سوانح "جہان دانش" کے نام سے لکھی، جدوجہد اور عزم وہمت سے زندگی کی کامیاب راہیں تلاش کرنے والوں کے لیے اس میں حوصلہ اور عبرت کا بڑا سامان ہے یہاں "جہان دانش" سے چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں:

بھولی بھالی

شروع شروع میں میری اہلیہ دنیا کے رسم ورواج اور آئین وضوابط سے صرف اتنی بہرہ مند تھی کہ ایک دفعہ نہ جانے کس بات پر میں نے تنبیہ کی مگر اس کی حاضر جوابی پر اس قدر غصہ آیا کہ میرے منہ سے یہ فقرہ نکل گیا "میرے ساتھ تمہارا نباہ مشکل ہوگا، میرا پیچھا چھوڑو اور اپنی راہ لو"۔ اس نے میری برہمی سے بے پروا ہو کر لمحہ بھر کے توقف سے جواب دیا۔ "اچھا میں ابھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی، خدا رکھے میری ماں اور میرے بھائی موجود ہیں۔ آپ میرا مہر معاف کرادیں۔" میرا یہ سننا تھا کہ غم و غصہ فرو ہو گیا، مسکراتا ہوا باہر نکل آیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دور میں مجھے خدا نے کیسی شریک حیات عطا فرمائی ہے جو یہ بھی نہیں جانتی کہ مہر کی ادائیگی کس کا فرض ہے اور اس کی طلبی و معافی بیوی کی طرف سے ہوتی ہے یا شوہر کی طرف سے۔"

(جہان دانش ص:۳۸۵)

ستم سے زیادہ کرم یاد آیا

مجھے ایک دن میں کئی آدمیوں نے یہ واقعہ سنایا کہ دن کے ڈیڑھ دو بجے اسپتال کے بغلی دروازے سے جو اسپتال کی روڈ کی طرف کھلتا ہے ایک بڑے ڈیل ڈول کا مگر نہایت مغموم مسلمان اسپتال سے نکل کر آرہا تھا، اتنے میں اسی سڑک پر ایک سکھ کا گزر ہوا، اسے دیکھتے ہی مسلمان کی آنکھیں سرخ شعلوں سے بھر گئیں، اس نے گلدار کی طرح جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور پھر اس کو پاؤں سے دبا کر بری طرح پیٹنا شروع کردیا، لاہور کی سڑکیں جہاں ہر وقت آدمیوں کا سیلاب موجیں مارتا رہتا ہے، فوراً سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے اور سکھ کو چھڑانے لگے لیکن اس سردار نے بڑے تلخ لہجے میں اپنے مددگاروں کو روک دیا اور بڑے روشن لہجے میں کہا، ”مجھے کوئی نہ چھڑائے“ لوگوں نے مسلمان کو پکڑ لیا، اور سردار سے سوال کیا ”یہ کیوں؟“ سردار نے کہا ”میں نے اس کے خاندان کو قتل کیا ہے، اور وہ بے گناہ تھے! میرا انھوں نے کوئی نقصان نہیں کیا تھا۔ مگر میں اس وقت لالہ کے اکسانے اور بھڑکانے میں آگیا اور قتل وغارت پر کمر باندھ لی، لیکن گھر جا کے جو سوچا تو میرے ضمیر نے میری نیندیں چھین لیں، جب سوتا ہوں تو خواب میں وہی ماحول دکھائی دیتا ہے کہ لالہ دونی چند غارتگری کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم لوگ ان کے اشاروں پر بے گناہوں کا قتل عام کر رہے ہیں، پولیس اور فوج ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم جنگلوں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں دبکتے پھرتے ہیں، فوراً آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر صبح تک نیند نہیں آتی، آخر میں نے طے کر لیا تھا کہ جب رستے کھل جائیں گے تو لاہور جا کر خود کو ان میاں صاحب کے سپرد کر دوں گا جو سامنے کھڑے ہیں۔ میں صرف اسی لیے لاہور آیا تھا اور ان کے گھر جا رہا تھا کہ ان کے دروازے پر ان کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤں تاکہ روح کو ندامت اور ضمیر کو ملامت سے نجات ملے، اتفاق ہے کہ یہ رستے ہی میں مل گئے۔ آپ لوگ مجھ پر کرم کریں، انہیں چھوڑ دیں اور مجھے نہ بچائیں، میں تو انہی کے ہاتھ سے مر کر سکون پا سکتا ہوں اور یونہی میری مکتی ہو سکتی

ہے، یہ کہہ کر وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا اور اس شخص سے کہا "آؤ، اپنا کام کرو اور مجھے تکلیف سے چھڑا دو! میں خدا سے پہلے تمہارا گناہ گار ہوں!"

یہ سن کر مسلمان کے سینے میں اپنے اسلاف کی روح عود کر آئی، اس نے سردار کو سینے سے لگالیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "میں نے اور میرے خدا نے تمہیں معاف کر دیا! میرے ساتھ گھر چلو! تم میرے مہمان ہو" چنانچہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر موڑ مڑ گئے۔ میں حیران رہ گیا کہ آج بھی مسلمان امیر المومنین حضرت علیؓ کی طرح کردار کی اسی بلندی پر ہیں اور قاتلوں کو معاف کر سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اسلام کے ان بنیادی کرداروں کی برکت ہے جن پر اسلام کی تاریخ ناز کرتی ہے۔

(جہان دانش ص:٦١٨ تا ٦٢٠)

بے دردوں نے تماشا بنادیا

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو جنونِ وطن اور جوش ایمان میں (پاکستان کی طرف ہجرت کر کے) نکل تو آئے لیکن یہاں ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی چونکہ معزز خاندان تھے اس لیے افسروں کے دروازوں کی جھڑکیاں ان کی قوت برداشت سے باہر تھیں، میں نے بچشم خود بیگمات کی شادیوں کے جوڑے اور کنواری لڑکیوں کے جہیز گلی کوچوں کی خاموشی میں اونے پونے بکتے دیکھے ہیں اور کلیجا پکڑ کر رہ گیا ہوں۔

اس ہجومِ افلاس میں کسی قصبے کا ایک شخص جو گھر کا سامان بیچ کر افلاس سے ہار مان چکا تھا اپنی علمی قابلیت کے بھروسے پر مصائب کے جبڑوں میں دبا دبایا ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا کہ شاید یہاں کوئی گنجائش نکل آئے، اسے کیا معلوم تھا کہ شرافت اور قابلیت دونوں اس ادارے میں کھوٹے سکے قرار پاتے ہیں، یہ انسان تو بھیڑیوں کی طرح غول کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں ان کے یہاں رجسٹروں میں رحم و انصاف کے خانے نہیں، یہ شعور انسانی سے عاری، حب انسانی سے نابلد ہیں۔

مگر بھوک اور عزت نفس کا تحفظ انسان کو ایسے ایسے مقامات پر لے جاتا ہے جہاں کے چند لمحے بھی عقبیٰ کے راستے کا بوجھ بن جاتے ہیں اور اس غریب پر کچھ ایسا ہی وقت پڑا ہوا تھا۔ ریڈیو کے ماحول میں بھلا اس مصیبت زدہ کی ڈوبتی ہوئی نبضوں اور بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں کو کون دیکھنے والا تھا، وہاں تو نغمہ وساز اور کاکل ورخسار کا کاروبار تھا۔

اس نے دفتر میں قدم رکھا ہی تھا کہ دو تین چہروں نے بلند آواز اور طنزیہ انداز میں کہا "باادب، باملاحظہ، ہوشیار!" وہ غریب یہ سمجھا کہ یہ حکم میرے لیے ہے چنانچہ اس نے نمازیوں کی طرح دونوں ہاتھ باندھ لیے اور بے گناہ مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کرسی نشین: "کیا بات ہے بڑے میاں؟......" اجنبی: "میاں میں پڑھا لکھا انسان ہوں اور فاقوں پر نوبت ہے مجھے کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے تو خدا اس کا اجر دے گا تمہیں"...... ایک چپراسی اشارہ پاکر: "آپ ذرا باہر تشریف رکھیں"......اتنے میں ادارے کے ایک مزاح نگار نے ایک کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر کاغذ کو دیوار کی انگیٹھی کے خلاء میں ٹھونس دیا اور ایک اسٹول انگیٹھی کے سامنے بچھوا کر کہا...... "بڑے میاں آیئے، دیکھیے اسٹول پر بیٹھ کر اس درمیانی خلاء کے قریب منہ کر کے کوئی غزل پڑھیے، ہم آپ کی آواز ٹیسٹ کر رہے ہیں پھر پروگرام کے متعلق بات ہو جائے گی" اجنبی غریب اسٹول پر انگیٹھی کے خلاء کے قریب منہ کر کے بیٹھ گیا اور ان میں سے ایک نے اسے ایک غزلوں کی کتاب تھمادی اور کہا" اس میں سے کوئی غزل پڑھیے"......اجنبی نے پہلے صفحے سے ایک حمد پڑھی اور پورا عملہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا جب مقطع آیا تو اس مزاح نگار نے انگیٹھی میں سے وہ کاغذ نکال کر غور سے دیکھا اور کہا...... "بڑے میاں! یہ لکیریں باقاعدہ ہونی چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہے ہمیں افسوس ہے نہ تو آپ جوان ہیں کہ آپ کو جوانوں کے پروگرام میں لے لیں اور نہ ابھی اس قدر بوڑھے ہیں کہ پوپلے منہ سے بوڑھوں کی صف میں آجائیں، ہاں اگر دانت نہ ہوتے تو ہمارے یہاں اچھے پروگرام ملتے رہتے، ہمیں آج کل ایسے فنکاروں کی ضرورت ہے"...... اجنبی کے چہرے پر ایک سایہ سا کانپا اور وہ مایوسی میں پیشانی پر پسینہ اور چہرے پر آنسوؤں کی لہراتی ہوئی روشن لکیریں لیے ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکل آیا حالانکہ ایسے موقعوں پر

شقاوتوں کے بڑے بڑے تودے پگھل کر بہہ جاتے ہیں لیکن اس ادارے کے اراکین میں سے کسی کا قہقہہ نہ مرجھایا، اجنبی کے سامنے بیوی بچوں کی نمناتی صورتیں اور ان کا انجام تھا چنانچہ اس نے گھر کی کوئی چیز فروخت کر کے اچھے خاصے دانت نکلوادیے اور کئی روز بعد پھر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا اور کہنے لگا"......میں نے آپ کی مرضی کے مطابق اپنے دانت نکلوادیے ہیں، اب تو آپ مجھے پروگرام دیں گے نا؟"۔

اراکینِ ریڈیو سناٹے میں آگئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے، کئی نے مسکراہٹ روکی، کئی نے آنسو اور اُسے ایک پندرہ روپے کا پروگرام دیا۔ وہ اس طرح گھر لوٹا جیسے کسی کے زخم پر پھاہا لگا دیا گیا ہو، نامعلوم بعد میں ریڈیو والوں نے کب تک اسے قابل توجہ گردانا ہوگا اور اس کے اس ایثار کی کیا قیمت لگائی ہوگی، میرے ذہن میں ریڈیو کے اراکین اور ان کے سیہ گوش حواریوں کے نجانے کتنے واقعات ہیں لیکن کیا فائدہ؟

(جہان دانش ص ۶۴۰ تا ۶۴۳)

اک بار جو بھٹکا تو بھٹکتا ہی رہے گا

میرے کرم فرما ڈاکٹر صدرالدین بھی تھے، جنہوں نے میرے زخمی ہونے پر بڑی شفقت اور توجہ سے میری دیکھ بھال کی تھی، ان کی نیلی آنکھیں گورے چہرے پر سنہری حسین داڑھی کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں اور اس پر ان کی آہستہ کلامی اور بھی جاذب توجہ ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر صدرالدین کے یہاں اس وقت کوئی اولاد نہ تھی اور جس نام و نمود کی حسرت نے انہیں شعر وشاعری کا دلدادہ اور صوفیاء کا پرستار بنادیا تھا، ان کی آرزو تھی کہ تاریخی طور پر تصنیف و تالیف کی صورت میں اپنی یادگار چھوڑیں اور ایک پیر طریقت کی حیثیت سے زندگی بسر کریں، یہی وجہ تھی کہ مقامی صوفیوں اور تیسرے درجہ کے خستہ حال شاعروں سے ان کا میل جول بڑھ رہا تھا، جن میں میری شمولیت بھی تھی، صوفی صدرالدین جب محفل سماع میں بیٹھتے تو ان کے مریدان باصفا، ان کے احترام میں دوزانو

ہو جاتے اور قوالی شروع ہوتے ہی جہاں پیر صاحب کی زبان سے "واہ" نکلتی تو وہ کچے صوفیوں کی جماعت یوں جھولتی اور جھومتی جیسے آندھی درختوں سے گھس کر گذر رہی ہو۔

جب پیری مریدی میں ڈاکٹر صاحب کے پاس عورتوں کی آمدورفت شروع ہوئی تو ان کی خواہش اولاد جو برسوں سے خاموشی کے لبادے میں گھات لگا رہی تھی، ہر اچھی صورت کو دیکھ کر گڑگڑانے لگی اور آخر کار صوفی صدرالدین نے ایک معتقد عورت کو اپنے نکاح میں لے لیا اور اس سے ان کے ماشاء اللہ کئی بچے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو جب اولاد کی طرف سے سکون ہوا تو تصوف کی وہ ہما ہمی نہ رہی، ان کی جوانی اور طلب اولاد کا آسیب فکر دنیا نے اتار دیا، تمام اوراد و اشغال ماضی مرحوم کی چیز ہو کر رہ گئے، بلکہ وہ ان مسائل سے دور نظر آنے لگے، ایک دن ان سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے ایک بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یار! صحیح تصوف تو یہ ہے ہم جس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ انہی معصوم صورتوں میں ملتی ہے"......اب ڈاکٹر صاحب ہیں اور ان کے یہ تصورات!

(جہان دانش، ص:۵۷)

کیفی رہ الفت میں قدم سوچ کے رکھنا
ایک بار جو بھٹکا تو بھٹکتا ہی رہے گا

☆☆☆☆

پھروں نہ حشر کے میداں میں اجنبی کی طرح

آخر میں احسان دانش کی یہ ایمان افروز نعت بھی پڑھیے:

ہے ان کی یاد کا عالم بھی بندگی کی طرح
غموں میں بھی مجھے لذت سی ہے خوشی کی طرح
زہے ہوائے مدینہ زہے دیارِ رسول
کہ بے خودی کا ہے عالم خود آگہی کی طرح

یہ آرزو ہے درِ مصطفیٰ پہ دم نکلے
یہ فرض بھی ہو ادا، قرضِ زندگی کی طرح

ترے خیال سے محروم ہر قدم پہ حیات
گذر رہی ہے بالاقساط خود کشی کی طرح

ہیں کب سے تیرگیاں میرے غمکدے کا کفن
چلے بھی آؤ کسی روز چاندنی کی طرح

یہ عشق ہے کہ جنوں کا کوئی مقام بلند
ہجوم غم بھی ہے پندارِ بندگی کی طرح

مری نظر ہے تمہیں پر مری خبر لینا
پھروں نہ حشر کے میداں میں اجنبی کی طرح

کمالِ قلب ونظر ہو کہ روح کی معراج
خدائی کی مرے آقا نے بندگی کی طرح

شہید اگرچہ نگاہوں سے ہو گئے روپوش
ہر اک ہے وقت کے پردے میں خلوتی کی طرح

دیے کی طرح ستارے بھی دے رہے ہیں جواب
دیارِ دل میں اتر آؤ روشنی کی طرح

وہ موجِ کیف ترے نام سے جو مشتق ہے
رواں ہے جسم کی رگ رگ میں سنسنی کی طرح

غمِ رسول فروزاں ہے جن کے سینوں میں
وہ ظلمتوں سے گزرتے ہیں روشنی کی طرح

عیاں ہیں جن پہ شہادت کے راز اے دانشؔ
وہ لوگ موت پہ گرتے ہیں زندگی کی طرح

☆☆☆☆

حافظہ

عربی زبان کے مشہور ادیب وماہر "اصمعی" کے حافظہ کا اندازہ آپ اس واقعہ سے لگا سکتے ہیں، جو علامہ ابن خلکان نے "وفیات الأعیان" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امیر حسن ابن سہیل نے ادیبوں کو جمع کیا جن میں اصمعی، ابو عبیدہ اور نصر بن علی وغیرہ شامل تھے۔ ادیبوں کے ساتھ گفتگو شروع کرنے سے قبل، امیر نے مختلف ضروریات کے لئے دی گئی، پچاس درخواستوں پر اپنی صوابدید کے مطابق احکامات لکھ کر جاری کئے، پھر ادیبوں سے گفتگو شروع کی، محدثین کا تذکرہ چلا تو ابو عبیدہ، اصمعی پر تعریض کرتے ہوئے کہنے لگے کہ جناب! اس مجلس میں بھی موجود کچھ لوگ اسلاف جیسے حافظہ کا دعوی کر کے کہتے ہیں کہ...... "ایک بار کوئی کتاب پڑھنے کے بعد دوبارہ اس کے دیکھنے کی انہیں ضرورت ہی نہیں پڑتی اور کوئی بات ایک مرتبہ ان کے ذہن میں داخل ہو جائے تو پھر کبھی نہیں نکلتی"...... اصمعی نے کہا "جناب! ابو عبیدہ مجھ پر تعریض کر رہے ہیں لیکن واقعہ وہی ہے جیسا انہوں نے بیان کیا، ابھی آپ نے پچاس درخواستوں پر مختلف احکامات لکھے، قریب ہونے کی وجہ سے میں دیکھ رہا تھا اگر آپ چاہیں تو وہ تمام درخواستیں منگوالیں، ہر درخواست میں جو کچھ لکھا ہو گا، میں تمام زبانی سنائے دیتا ہوں" چنانچہ اصمعی نے وہ تمام درخواستیں اور امیر کی طرف سے ان پر لکھے گئے احکامات سنانا شروع کئے، جب چالیس سے کچھ اوپر پہنچے تو نصر بن علی نے اصمعی کو منع کیا کہ کہیں "نظر بد لگ جائے گی" تب اصمعی رک گئے۔

(وفیات الأعیان، ج:۳، ص:۱۷۳)

اعتماد کا کرشمہ

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمتہ اللہ اپنی "آپ بیتی" میں لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہ قصہ سُنا کہ ضلع سہارنپور میں "بہٹ" سے

آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں، اس کے قرب وجوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے اوران کے مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے اور وہ انگریز دہلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے، کبھی کبھی معائنہ کے طور پر آکر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے، ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری ہی کوٹھیاں جل گئیں، ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دہلی بھاگا ہوا گیااور جاکر واقعہ سنایا کہ ”حضور! سب کی کوٹھیاں جل گئیں، آپ کی بھی جل گئی“ وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے التفات بھی نہیں کیا۔ ملازم نے دوبارہ زور سے کہا کہ ”حضور سب جل گیا“ اس نے دوسری دفعہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی اور بے فکر لکھتا رہا، ملازم نے جب تیسری دفعہ کہا تو انگریز نے کہا کہ ”میں مسلمانوں کے طریقہ پر زکوۃ ادا کرتا ہوں اس لیے میرے مال کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا“ وہ ملازم تو جواب دہی کے خوف کے مارے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کی، وہ انگریز کے اس لاپرواہی سے جواب سُن کر واپس آگیا، آکر دیکھا تو واقع میں سب کوٹھیاں جل چکی تھیں مگر اس انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔

(آپ بیتی جلد:۱، ص:۸۸)

ماحول کا اثر

ماحول کے اثر کے متعلق حضرت شیخ الحدیثؒ ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

”اسی کے ساتھ ایک دوسرا قصہ بھی میں نے اپنے والد صاحب سے کئی مرتبہ سُنا کہ جب ”نہر جمن“ کھودی جارہی تھی جورائے پور سے لے کر سہارنپور، کاندھلہ ہوتی ہوئی دہلی تک پہنچی

ہے تو نانوتہ کے قریب زمین کھودتے ہوئے زمین کے اندر سے سونے کی ایک بہت لمبی، بہت موٹی سری نکلی جو مزدوروں نے سقہ کو دے دی جو وہاں پانی ڈالا کرتا تھااور وہی کل مزدوروں کا گویا چودھری یا امیر تھا۔ اس سقے نے دو مزدوروں کو لے کر اسے اٹھالیااور قریب ہی ایک انگریز کاڈیرا تھا جو گویا اس سارے کاروبار کاافسر اعلیٰ تھااور ٹھیکیدار تھا، اس کو لے جا کر دی، اس نے اس کو رکھ لیااور اس کااندراج کرلیا، مگر ان مزدوروں پر اور سقے پر بہت تعجب کرتا رہا کہ اتنی بڑی دولت ان کو ملی، آپس میں بانٹ لیتے تو خبر بھی نہ ہوتی، بیس، پچیس سال کے بعد جب کہ یہ انگریز مظفر نگر کا کلکٹر بنا، اس کی عدالت میں یہ مقدمہ پیش ہوا کہ ایک سقے نے ایک کمسن بچی کے کان میں گلٹ کی بالیاں تھیں، اس سقہ نے سونے کی سمجھ کر اس لڑکی کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیااور بالیاں نکال لیں۔ یہ سقہ پیش ہوااور اس نے اقرار بھی کرلیا، اس کلکٹر نے اس کو پہچان لیااور اس سے دریافت کیا کہ تو وہی سقہ ہے جو "جمن" کی کھدائی میں تھااور سونے کی سری واپس کردی تھی، اس نے اس کا بھی اقرار کیا۔ کلکٹر نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ "اس وقت ہمارے ذہن میں یہ تھا کہ دوسروں کی چیز نہیں لی جاسکتی، اس کو ہم سور کھانے سے زیادہ برا سمجھتے تھے اور آج کل یوں ہے کہ جو مل جاوے وہ اپنا ہی ہے"...... کلکٹر نے مقدمہ کو یہ کہہ کر خارج کردیا کہ یہ ہماری حکومت کا اثر ہے، اس کا قصور نہیں۔"

(آپ بیتی جلد:۱، ص:۱۰۸)

☆☆☆☆

بدلتا ہے رنگ دل کیسے کیسے

انسان کے دل کا بھی عجیب حال ہے، کبھی ایک حالت پر نہیں ٹھہرتا، اسی لیے کہا جاتا ہے "الاستقامة فوق الف كرامة" یعنی استقامت ہزار کرامتوں سے فائق ہے، ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا تو مسلمان بڑی تعداد میں بھارت سے پاکستان ہجرت کر رہے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ ان دنوں تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدین میں تھے، وہاں کے ایک مولوی صاحب کا واقعہ تحریر فرماتے ہیں:

> "مولانا یوسفؒ (حضرت جی) صبح سے شام تک منبر پر تقریر کرتے رہتے اور اللہ پر اعتماد، موت کے ڈر سے فرار کی مذمت بہت ہی جوش سے بیان فرمایا کرتے تھے اور جب کسی ضرورت سے مولانا منبر سے اتر جاتے تو یہ مولوی صاحب منبر پر پہنچ جاتے اور مولانا مرحوم سے بھی زوردار انداز میں ان کے مضمون کو واضح کرتے اور پاکستان نہ جانے پر زور دیتے۔ مولانا کے آنے پر منبر سے اتر جاتے۔
>
> ایک مرتبہ مولانا یوسفؒ صاحب ظہر کی نماز پڑھتے ہی کسی ضرورت سے گئے تو ان صاحب نے فوراً منبر پر جاکر نہایت شدت سے حسب معمول تقریر شروع کی، میں بھی مولوی یوسف مرحوم کے حجرے میں بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ مولوی صاحب مولانا یوسفؒ کے آنے پر منبر سے اتر کر فوراً میرے حجرے میں آئے اور آتے ہی مجھ سے کہا کہ "آپ مجھے پاکستان جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں"......

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ابھی تو کتنے زور و شور کی تقریر کی اور اب پاکستان جانے کی اجازت مانگ رہے ہیں، میں نے حسب عادت کہدیا کہ "شوق سے چلے جائیں"۔ کہنے لگے "میں حضرت جی (مولانا یوسفؒ) کی زبان سے اجازت چاہتا ہوں، میں نے کہا "میری اجازت ہی ان کی اجازت ہے، شوق سے چلے جاؤ" انہوں نے بہت گھبرائی ہوئی صورت میں یوں کہا "حضرت! مجھے آج ہی جانا ہے اور حضرت جی کی زبان سے اجازت چاہتا ہوں" میں نے مولانا یوسفؒ کے پاس ایک آدمی بھیجا اور وہ ایک دم منبر سے اتر کر آئے۔ میں نے کہا، "بھائی! یہ جانا چاہتے ہیں میں نے اپنی اور تمھاری طرف سے اجازت دے دی مگر یہ تمہاری زبان سے اجازت مانگتے ہیں" مرحوم نے بہت ہی غصہ سے کہا کہ "بھائی جی کی اجازت کے بعد میری اجازت کی کیا ضرورت ہے، شوق سے چلے جاؤ"۔

مرحوم کے واپس جانے کے بعد میں نے ان سے کہا "اللہ حافظ" انہوں نے اسی وقت نظام الدین کے بہت سے خواص کو بڑے اہتمام سے جمع کر کے مسجد کے باہر نیم کے درخت کے نیچے لے جا کر بہت زور دار تقریر جتنی مسجد میں لوگوں کو روکنے کے لئے کر رہے تھے، اس سے زیادہ زوردار اب لوگوں کو جانے پر آمادہ کرنے کے لئے کی، اور کہا کہ حضرت جی (مولانا یوسفؒ) تو حضرت شیخ کی وجہ سے مجبور ہیں اور حضرت شیخ محض شہادت کے شوق میں یہاں پڑے ہوئے ہیں"۔

(آپ بیتی جلد:۲، ص:۵۷۳)

☆☆☆☆

داغِ یتیمی

عتبی پر اسی (۸۰) سال کی عمر میں شادی کا شوق سوار ہوا کسی نے اس عمر میں اس شوق کی وجہ دریافت کی تو جواب دیا کہ اس زمانے کی اولاد بڑی نافرمان ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ انہیں داغ یتیمی دے جاؤں، اس سے پہلے کہ وہ میری نافرمانی کر کے مجھے رسوا کریں۔

(رفیق المسلم فی الأسفار ص:۲۸)

شک وتردد سے نجات کا حل

ایک مرتبہ حجاج شاعر ایک گلی سے گذرا جس میں پرنالہ تھا، تو رک کر سوچ میں پڑ گیا کہ اس کے چھینٹے مجھ پر پڑے ہیں یا نہیں۔ جب تردد اور اضطراب بڑھ گیا اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا تو آکر پرنالے کے نیچے بیٹھ گیا، کہنے لگا، اب اطمینان ہو گیا اور یقین نے شک کو ختم کر دیا۔

(رفیق المسلم فی الأسفار ص:۲۹)

ہمہ دانی کا بھرم

ایک شخص بڑا ذہین اور صاحب علم مشہور تھا، ہر سوال کا جواب بغیر کسی توقف کے دیا کرتا تھا۔ اس کے بعض ساتھی اس کے تبحر علمی کی حقیقت تاڑ گئے اور امتحان کے ارادے سے ایک مہمل لفظ "خنفشار" کے بارے میں دریافت کیا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی، اس نے بلا جھجک کہنا شروع کیا:

"یہ ایک خوشبودار گھاس ہے جو یمن کے مضافات میں

پائی جاتی ہے، اس کی حیرت انگیز خاصیت یہ ہے کہ جب جانور اس کو کھاتا ہے تو اس کا دودھ رک جاتا ہے، ایک یمنی شاعر کہتا ہے

لقد عقدت محبتکم فؤادی   کما عقد الحلیب الخنفشارُ

(آپ کی محبت نے میرے دل کو اس طرح جکڑ رکھا ہے جیسے خنفشار گھاس دودھ کو روک لیتی ہے)

داود انطاکی نے "اپنے تذکرہ" میں اس طرح کہا ہے اور فلاں فلاں نے یہ کہا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا......"

فوراً ساتھیوں نے اسے روک دیا اور کہا "کم بخت! ان سب پر تو تو نے جھوٹ گھڑا ہی ہے کم از کم نبی کریم ﷺ کی ذات سے تو حیا کر" اس طرح ان پر اس کے تبحر علمی کا راز کھل گیا اور ہمہ دانی کا بھرم جاتا رہا۔

(التعالم وأثره علی الفکر و الکتاب ص:١٥)

حیرت انگیز حافظہ یا خوبصورت جھوٹ؟

ابو عمر الزاھد جو غلام ثعلب (ثعلب کے غلام) کے لقب سے مشہور تھے اپنے حیرت انگیز حافظہ کی بناء پر بڑی شہرت رکھتے تھے۔ اسی بے پناہ قوت یادداشت کی وجہ سے ان کو اہل ادب کی تیغ ستم کا ہدف بننا اور علم لغت میں ان کی سند ثقاہت سے محروم ہونا پڑا، جبکہ کہ طبقہ محدثین نے انہیں ثقہ قرار دیا تھا، ان کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ بغداد کے کچھ لوگ ان پر لگائے گئے جھوٹ کے الزامات کا تذکرہ کرتے ہوئے راستے کے ایک پل سے گذرے تو ان میں سے ایک نے کہا، ایسا کرتے ہیں کہ قنطرۃ (پل) کے لفظ کو الٹ کر اور اس کو بے معنی اور مہمل بنا کر اس کے معنی ابو عمر سے دریافت کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا جواب دیتے ہیں، جب ان کے پاس پہنچے تو اس شخص نے کہا: ایہا الشیخ ما الھرطنق عند العرب؟ حضرت! عرب کے ہاں "ھرطنق" کیا شے ہے؟......اس نے کہا "فلاں چیز ہے اور

اس طرح ہوتی ہے" یہ سن کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے کیوں کہ یہ تو ایک مہمل لفظ انہوں نے اپنی طرف سے گھڑا تھا، جس کے کوئی معنی نہیں تھے، اور وہاں سے چلے آئے۔ تقریباً ایک مہینے بعد پھر انہوں نے کسی دوسرے شخص کو، " ھر طنق " کے معنی دریافت کرنے اس کے پاس بھیجا تو اس نے کہا "کیا یہ وہی لفظ نہیں جو فلاں دن فلاں موقع پر مجھ سے پوچھا گیا تھا" پھر اس نے بعینہ پہلے والا جواب دیا۔ یہ سن کر وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم فیصلہ نہیں کر پاتے کہ اس کی حیرت انگیز قوت حافظہ پر تعجب کریں اگر اس نے سچ کہا ہے یا اس کے خوبصورت جھوٹ پر اگر اس نے جھوٹ کہا ہے۔

(التعالم وأثرہ علی الفکر والکتاب:۱۹۔۲۰)

جھوٹی دلیل

احمد بن عبداللہ الجوباری کی فریب کاریوں میں سے ایک مشہور فریب یہ ہے کہ جب اس کے سامنے محدثین کا اختلاف ذکر ہوا کہ حضرت حسن بصریؒ کا سماع حضرت ابوہریرۃ سے ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس نے فوراً ایک سند شروع کر دی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا کر کہا، " انّ النبیّ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم قال: سمع الحسن من أبی ھریرۃؓ" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ حسن نے ابوہریرہ سے سنا ہے۔

(میزان الاعتدال: ج:۱، ص:۱۰۸)

چار مرد، چار خواہشات

حضرت معاویہؓ کے عہد خلافت میں عبدالملک بن مروان، عبداللہ بن زبیر اور ان کے دونوں بھائی مصعب بن زبیر اور عروہ بن زبیر، ایک مرتبہ مسجد حرام میں مل بیٹھے تو ان میں سے کسی نے کہا کہ آج آپس میں اپنی اپنی خواہشات کا اظہار کرنا چاہیے۔

عبداللہ بن زبیر نے ابتدا کرتے ہوئے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں حرمین پر

قبضہ کر کے خلافت حاصل کرلوں۔

مصعب بن زبیر نے کہا میری آرزو ہے کہ دونوں عراقوں پر قبضہ کرلوں اور قریش کی دو شریف زادیوں سکینہ بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ کو اپنے عقد نکاح میں لے آؤں۔

عبد الملک بن مروان نے کہا میری خواہش ہے کہ حضرت معاویہؓ کا جانشین بن جاؤں اور ساری دنیا پر بادشاہت کروں۔

جب سب اپنی خواہشات کا اظہار کر چکے تو حضرت عروہ بن زبیر نے کہا کہ تمہاری خواہشات تمہیں مبارک، میری تو صرف یہ تمنا ہے کہ دنیا سے بے رغبتی اور آخرت میں جنت کا پروانہ مل جائے اور مجھ سے اس علم (یعنی علم حدیث) کا فیضان جاری ہو جائے۔

نیرنگیٔ تقدیر دیکھئے کہ ہر ایک کی خواہش و تمنا کی تکمیل ہو گئی اور ہر ایک نے اپنی آرزو کو پا لیا، حضرت عروہ بن زُبیرؓ کو علم حدیث میں اللہ تعالیٰ نے جو مقام عطا فرمایا اور ان کا جو فیض جاری ہوا، وہ اہلِ علم جانتے ہیں، انکی یہ ایک تمنا تو بر آئی، دوسری تمنا جنت کی تھی، عبد الملک بن مروان کہا کرتا تھا جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہے تو عروہ بن زبیر کو دیکھے۔ (کیونکہ انہوں نے جنت کی خواہش کی تھی)

(وفیات الأعیان جلد :۳،ص:۲۵۸)

ہوں گی اے لفظِ محبت! تیری تعبیریں بہت

ایک روز حکیم احمد شجاع علامہ اقبال کے مکان پر پہنچے تو علامہ کو بہت زیادہ فکر مند، مغموم اور بے چین پایا، حکیم صاحب نے گھبرا کر دریافت کیا، ”خیر تو ہے؟ آپ آج خلاف معمول بہت زیادہ مضطرب اور پریشان نظر آتے ہیں“ علامہ نے خاص انداز میں نظریں اوپر اٹھائیں اور غم انگیز لہجے میں فرمایا:

”احمد شجاع! یہ سوچ کر میں اکثر مضطرب اور پریشان ہو جاتا ہوں کہ

کہیں میری عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر سے زیادہ نہ ہو جائے"۔

(روزگار فقیر از فقیر وحید الدین: ج ۲،: ۳۲۸)

عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آئینہ دار اقبال کے یہ اشعار بھی پڑھیے:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

☆☆☆☆

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ

امین گیلانی صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا نور الحسن صاحب بخاری مرحوم تحریر فرماتے ہیں اور راقم الحروف نے بھی یہ واقعہ خود حضرت عطاء اللہ شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی زبانی سنا کہ خیر المدارس جالندھر کے جلسہ میں شریک تھے۔ کھانے کے دستر خوان پر بیٹھے تو سامنے ایک نوجوان بھنگی کو دیکھا، شاہ جیؒ نے کہا کہ "آؤ بھائی کھانا کھالو" اس نے عرض کیا "جی میں تو بھنگی ہوں" شاہ جی نے درد بھرے لہجہ میں فرمایا، "انسان تو ہو اور بھوک تو لگتی ہے" یہ کہہ کر خود اٹھے، اس کے ہاتھ دھلا کر ساتھ بٹھا لیا، وہ بے چارا تھر تھر کانپتا تھا اور کہتا جا رہا تھا کہ

"جی میں تو بھنگی ہوں" شاہ جی رحمتہ اللہ علیہ نے خود لقمہ توڑا ، شوربے میں بھگو کر اسکے منہ میں دے دیا۔ اس کا کچھ حجاب دور ہوا تو شاہ جی نے ایک آلو اس کے منہ میں ڈال دیا، اُس نے جب آدھا آلو دانتوں سے کاٹ لیا تو باقی آدھا خود کھالیا، اسی طرح اس نے پانی پیا تو اس کا بچا ہوا پانی خود پی لیا، وقت گزر گیا، وہ کھانے سے فارغ ہو کر غائب ہو گیا، اس پر رقت طاری تھی، وہ خوب رویا، اسکی کیفیت ہی بدل گئی۔ عصر کے وقت اپنی نوجوان بیوی جس کی گود میں ایک بچہ تھا لے کر آیا اور کہا، "شاہ جی! اللہ کے لئے ہمیں کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لیجئے" اور میاں بیوی دونوں اسلام لے آئے۔"

(بخاری کی باتیں ص: ۲۹، ۳۰)

جگر نے خوب کہا ہے: ؎

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ایک دفعہ لاہور کی آسٹریلیا مسجد میں فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے وعظ فرمایا تو امیر خسرو کے یہ اشعار پڑھے:

جان زتن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز
قیمت خود ہر دو عالم گفتہ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

(تو میرے جسم سے جان لے گیا لیکن میری روح میں تو اب تک بسا ہے، درد بھی تو نے ہی دیا اور اب اس کا معالج و درمان بھی تو ہے، اپنی قیمت تو نے دونوں جہاں بتائی ہے یہ تو بہت کم قیمت ہے اپنا نرخ بڑھایئے)

یہ شعر سنا کر حضرت شاہ صاحب پر تو بہت ہی رقت طاری ہو گئی یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہو گئی، فرمایا کہ "یہ شعر امیر خسرو کے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ شعر اس وقت کہے جب آپ کو آخری غسل دیا جا رہا تھا، نہ پوری عمر کسی کی غیبت کی، نہ غیبت سنی"

(ملفوظات محدث کشمیری ص ۴۰۹، از مولانا بجنوری)

جوہرِ خطابت

بہادر یار جنگ بر صغیر کے مشہور خطباء میں سے ایک ہیں، تحریک پاکستان کی تاریخ میں ان کی تقریریں یادگار رہیں گی، انہوں نے ایک تقریر میں قیام پاکستان کے لئے قربانی دینے کا مطالبہ کیا، جونہی مجمع سے آوازیں آئیں کہ "ہم بھی آپ کے ساتھ قربانی دینے میں دوش بدوش ہوں گے"...... بہادر یار جنگ نے کہا:

"اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے، میں نے اپنے جس عزم کا آج اظہار کیا ہے وہ میرے بارہ سالہ شبانہ روز فکر و تعمق کا نتیجہ ہے، میں نے اسکی تیاری اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا، جاؤ، اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ تصفیہ کرو، مسلمانو! جو تصفیے جوش کے عالم میں دوسرں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں، بسا اوقات آنی اور اسلئے فانی ہوتے ہیں، آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے، جو شجرِ ملت میں پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں، ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں، جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے

ہیں، ہم کو انکی ضرورت نہیں جو کاخ وایوان کے نقش ونگار بن کر نگاہ نظارہ باز خیرہ کرنا چاہتے ہوں، ہم ان بنیاد کے پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کیلئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں"۔

(آوازِ دوست از مختار مسعود ص: ۹۲)

فیشن کی شناخت

مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری تحریر فرماتے ہیں:

"آج کل معاشرہ میں یہ چیز زیادہ مقبول ہو رہی ہے کہ لڑکوں کو لڑکیوں کا لباس اور لڑکیوں کو لڑکوں کا لباس پہناتے ہیں اور نوجوان مرد وعورت اس سیلاب کے بہاؤ میں بہہ رہے ہیں، یہ طرز بھی یورپ اور امریکہ کے تابکاروں سے شروع ہوا ہے، ان کے نزدیک یہ فیشن اور فخر کی چیز ہے۔ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ کسی جگہ دعوت تھی، مرد اور عورت ایک ہی جگہ موجود تھے، ایک نوعمر کو دیکھا گیا کہ رواج کے مطابق میز پر کھانا لگا رہا ہے، کسی کی زبان سے یہ نکل گیا کہ "لڑکا بڑا ہونہار ہے، سلیقہ مندی سے کام کر رہا ہے" اس پر پیچھے سے آواز آئی کہ "میاں کیا فرما رہے ہیں، یہ لڑکا نہیں، میری لڑکی ہے" ان صاحب نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور ایک نظر ڈال کر کہا "معاف کیجئے، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس کی والدہ ہیں" اس نے فوراً جواب دیا کہ 'میاں! آپ صحیح دیکھا کیجئے، میں والدہ نہیں، اس کا والد ہوں"۔

(ترقی ص: ۵۲، از مولانا مفتی عاشق الٰہی بلند شہری)

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا......

مغرب میں خاندانی زندگی کی تباہی کا اندازہ اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ پیرس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص سے ملنے اس کے گھر گیا، اس نے دیکھا کہ مکان کی سیڑھیوں پر ایک جوان لڑکی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہے، اس شخص نے رک کر لڑکی سے رونے کی وجہ معلوم کی تو اس نے جواب دیا کہ جس شخص سے آپ مل کر آ رہے ہیں، وہ میرا باپ ہے، میں اس کے پاس اس مکان کا ایک کمرہ کرائے پر لینے آئی تھی، لیکن اس نے مجھے یہ کہہ کر کمرہ کرائے پر دینے سے انکار کر دیا ہے کہ ایک دوسری جگہ سے اسے زیادہ کرایہ مل رہا ہے، اس لئے وہ مجھے کمرہ کرایہ پر نہیں دے گا، لڑکی نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا، اب میں کیا کروں اور کہاں جاؤں؟

پولینڈ میں ایک بوڑھا اپنی بیٹی کے گھر آیا اور وہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کی، مگر بیٹی نے انکار کر دیا اور بوڑھے کے اصرار پر اسے ڈنڈے مار مار کر گھر سے باہر نکالا، شور سن کر لوگ جمع ہوئے تو بیٹی نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے رقم کی ضرورت پڑی تو میرے باپ نے باقاعدہ شرح سود طے کر کے مجھے رقم دی اور اصل زر کے ساتھ سود بھی وصول کیا، پھر میں اسے اپنے گھر کیوں ٹھہراتی"۔

(رواداری اور مغرب از محمد صدیق شاہ ص: ۲۲۳)

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

☆☆☆☆

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

مولانا عبدالعزیز میمنی برصغیر میں عربی ادب کے نامور ادیبوں میں سے ہیں، ڈاکٹر خورشید رضوی ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"انہوں نے مطالعہ میں کیسی جانکاہ محنت کی تھی، اس کا اندازہ اس بات سے ہو گا کہ ایک روز ازروئے شفقت انہوں نے میرے حافظے کی تعریف فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ حافظہ تو دراصل آپ کا ہے کہ اس پیرانہ سالی میں آپ کو اس قدر ادبی سرمایہ نوک زبان ہے، فرمایا، "نہیں، آپ ایک بار سن کر یاد رکھتے ہیں جب کہ میں نے یہ سب کچھ سو سو مرتبہ نظر سے گذارا ہے"

(تالیف از ڈاکٹر خورشید رضوی، ص: ۶۴)

بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

مکافاتِ عمل

احمد بن طولون کو اپنے حوض کے پاس ایک بچہ پڑا ہوا ملا، اس نے اس کو اٹھالیا اس کی پرورش اور دیکھ بھال بڑی توجہ اور جانفشانی سے کی، اس کا نام احمد رکھا اور وہ "احمد یتیم" کے نام سے مشہور ہوا، اللہ نے اس کو ذہانت وفطانت اور ظاہری وباطنی خوبیوں سے خوب نوازا تھا، احمد بن طولون کا جب آخری وقت آگیا تو اس نے احمد یتیم کو اپنے بیٹے ابوالجیش کے سپرد کر دیا، جب احمد بن طولون دنیا سے رخصت ہوا تو ابوالجیش نے احمد کو بلا کر کہا، "میں تمھیں اپنے یہاں ایک منصب پر فائز کرنا چاہتا ہوں لیکن میری یہ عادت ہے کہ میں کسی شخص کو کوئی ذمہ

داری سپرد کرنے سے پہلے اس سے یہ عہد و پیان لیتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ کسی قسم کی خیانت کا ارتکاب نہیں کرے گا" احمد یتیم نے عہد کر لیا تو ابو الجیش نے اسے اپنے مال واسباب کا نگران اور تمام حشم وخدم کا امیر مقرر کر دیا، ابو الجیش، احمد یتیم کا بڑا خیال رکھتا تھا احمد یتیم نے بھی اپنی ایمانداری، صاف گوئی، خدمت اور دیگر اعلیٰ صلاحیتوں کے ذریعہ اس کے دل میں گھر کر لیا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھریلو امور کے سلسلے میں بھی اس پر اعتماد کرتا تھا۔

ایک دن اس نے احمد یتیم سے کہا، "میری فلاں باندی کے کمرے میں جاؤ، جس جگہ میں بیٹھتا ہوں، وہاں ایک موتی رکھا ہوگا اسے لے کر آؤ" احمد یتیم جب اس کمرے میں داخل ہوا تو اس نے امیر ابو الجیش کی چہیتی اور خاص لونڈی کو ایک خادم کے ساتھ قابل اعتراض حالت میں پایا، خادم نے جب احمد یتیم کو دیکھا تو نکل بھاگا، لونڈی احمد یتیم کے پاس آکر اسے بھی پیش کش کرنے لگی، احمد یتیم نے کہا، "اللہ کی پناہ! میں اپنے محسن کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتا، میں نے اس کے ساتھ عہد کر رکھا ہے" یہ کہہ کر اس نے موتی اٹھایا اور امیر کی خدمت میں جا کر پیش کیا۔ احمد یتیم کے لونڈی کے یہاں سے اس طرح چلے آنے کے بعد وہ شدید ڈر اور خوف میں مبتلا ہو گئی کہ کہیں وہ امیر کو خبر نہ کر دے، مگر جب کچھ دن اطمینان سے گزر گئے اور امیر کے مزاج میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نظر نہ آئی تو لونڈی کے خوف میں کچھ کمی واقع ہوئی، لیکن پھر ایسا اتفاق ہوا کہ امیر نے ایک نئی لونڈی خرید لی، اور اس کو سب سے زیادہ چاہنے لگا طرح طرح کے انعام واکرام سے نوازنے لگا' پہلی لونڈی نے جب یہ صورتحال دیکھی تو وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگی، اس نے یہ یقین کر لیا کہ ضرور احمد یتیم نے اس کی خیانت کا ذکر امیر سے کر دیا ہے، لہذا اس نے احمد یتیم سے بدلہ لینے کی ٹھانی، چنانچہ ایک دن روتی ہوئی امیر ابو الجیش کے پاس آئی اور دھاڑیں مار مار کر کہنے لگی، "احمد یتیم نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی ہے" امیر نے جب یہ سنا تو غیظ و غضب سے کانپنے لگا اور فوراً اس کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنے ارادے کو مؤخر کیا، اپنے ایک قابل اعتماد خادم کو بلا کر کہا، "میں ایک شخص کو سونے کا طشت دیکر تمہارے پاس بھیجوں گا، وہ

جب تم سے آ کر کہے کہ اس طشت کو مُشک سے بھر دو تو تم اس کو قتل کر کے اس کا سر طشت میں ڈھانپ کر میرے پاس لے آنا" چنانچہ امیر نے اپنے خواص اور مقربین کی ایک محفل جمائی، مشروبات کا دور چلنے لگا، احمد یتیم بھی اسکے سامنے بیٹھا ہوا تھا، وہ بڑا پر سکون اور ہشاش بشاش تھا، اس کے چہرے پر کسی قسم کی کوئی پریشانی دکھائی نہ دیتی تھی، اتنے میں امیر نے ایک طشت احمد یتیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، "احمد یتیم! یہ طشت فلاں خادم کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ امیر نے اس میں مشک بھرنے کا حکم دیا ہے"۔

احمد طشت لے کر چل پڑا، راستے میں جب وہ باقی مصاحبین وخدام کے پاس سے گزرنے لگا تو انہوں نے اس کو روک لیا اور مجلس کے بارے میں پوچھنے لگے، احمد یتیم نے جان چھڑانے کی کوشش کی اور کہا، "مجھے امیر نے کسی کام سے بھیجا ہے" لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور کہا، کسی دوسرے کو بھیج دو، جب وہ لے آئے تو پھر تم امیر کی خدمت میں لے جانا، چنانچہ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظر اس خادم پر پڑی جس کو اس نے باندی کے ساتھ دیکھا تھا، احمد یتیم نے اسے طشت تھماتے ہوئے کہا، "فلاں خادم کے پاس جاکر اس سے کہو کہ امیر نے حکم دیا ہے اس کو مشک سے بھر دو" خادم نے جاکر اسی طرح کہا، امیر کے حکم کے مطابق خادم خاص نے اس کا سر کاٹا اور طشت میں ڈھانپ کر چل پڑا، راستے میں احمد یتیم نے اس سے طشت لے لیا اور اس سے بے پروا ہو کر کہ اس میں کیا ہے، امیر کی خدمت میں جا پہنچا، امیر نے جب اسے طشت لئے زندہ سلامت اندر آتے دیکھا تو حیرت سے کبھی احمد یتیم کو دیکھتا تو کبھی طشت کو، احمد یتیم نے طشت امیر کے سامنے رکھا اور کپڑا ہٹایا تو اسکی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اب وہ بھی گم صم تھا، کبھی طشت میں رکھے انسانی سر کو دیکھتا تو کبھی امیر کو۔ جب اسے کچھ سمجھ نہ آیا تو بے اختیار پکار اٹھا، "یہ کیا ہے؟" امیر خود اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، بالآخر اس نے امیر کے پاس سے طشت لے کر جانے سے واپس آنے تک کی ساری کارگزاری سنائی اور اس کے علاوہ کسی بات سے لاعلمی کا اظہار کیا، امیر نے احمد یتیم کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا، "تم اس کے متعلق ایسی کوئی بات جانتے ہو جس کی وجہ سے یہ اس انجام تک پہنچا ہے؟" احمد یتیم نے کہا، "اے امیر! اس نے

ایک خیانت کاارتکاب کیا تھا جس کا آج اسے خمیازہ بھگتنا پڑا ہے، میں نے آپ کو اطلاع نہ دیکر اس کے جرم کی پردہ پوشی کی تھی" پھر اس نے اوّل سے آخر تک ساری کہانی امیر کو سناڈالی، امیر نے لونڈی کو طلب کیا اور اس سے تفتیش کی تو اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا اور احمد یتیم کی پاکدامنی کی تصدیق کی، امیر نے لونڈی کو احمد یتیم کے سپرد کرتے ہوئے اس کے قتل کا حکم دیا چنانچہ لونڈی کو قتل کر دیا گیا، اس واقعہ کے بعد امیر ابوالجیش کی نگاہ میں احمد یتیم کی قدر و منزلت مزید بڑھ گئی اور اس نے تمام امور کی زمام تصرف اس کے حوالے کر دی۔ غور کریں دیانت دار کو اس کی دیانت کا صلہ اور خیانت والے کو اس کی خیانت کا بدلہ کس طرح ملا۔

(المستطرف ص:۲۱۵)

بے بسی

ایک مرتبہ سعید بن مسیّب کسی مجلس میں بیٹھے فرما رہے تھے "میں نے چالیس (۴۰) سال اس طرح بسر کئے کہ اذان سے قبل مسجد میں موجود ہوتا تھا" یہ کہہ کر وہ نماز کے ارادے سے اٹھے تو دیکھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے نکل رہے ہیں۔

(المستطرف فی کلّ فنّ مستظرف: ص:۷۳)

ایک مرتبہ قتادہ کہنے لگے "میں آج تک کوئی چیز نہیں بھولا" پھر غلام کو آواز لگائی "ذرا میرے جوتے لے آنا" غلام نے ادب سے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا "حضرت! جوتے تو آپ پہنے ہوئے ہیں"۔

(......ص:۷۳)

بلاعنوان

حجاج بن یوسف نے ایک اعرابی (دیہاتی) کو کسی علاقے کا والی بنا کر بھیجا، وہ ایک مدت تک اپنے اہل وعیال سے دور قیام پذیر رہا، ایک مرتبہ اس کی بستی کا کوئی شخص اس کے دروازے پہ پہنچا، وہ بھوک کی شدت سے نڈھال ہو رہا تھا، اعرابی نے اپنے اہل وعیال کی

خیریت معلوم کرنے کی غرض سے اس کی بڑی آؤ بھگت کی، اس کے سامنے کھانا پیش کیا اور پھر اپنے اہل خانہ کے بارے میں پوچھنے لگا:

اعرابی: میرے بیٹے عمیر کا کیا حال ہے؟

مہمان: ماشاءاللہ! اس نے تو آپ کے پوتے، پوتیوں سے پورا محلّہ آباد کر دیا ہے۔

اعرابی: عمیر کی ماں کیسی ہے؟

مہمان: وہ بھی خوش وخرم زندگی گذار رہی ہے۔

اعرابی: میرے کتے کے بارے میں کچھ بتاؤ؟

مہمان: تمھارا کتا تو دن، رات بھونک بھونک کے سارا محلّہ سر پہ اٹھائے رکھتا ہے۔

اعرابی: اچھا! یہ تو بتاؤ میرا اونٹ کس حال میں ہے؟

مہمان: تمہارا اونٹ بھی موج کر رہا ہے۔

جب اعرابی کو اپنے گھر بار کی خیریت وعافیت کے متعلق تسلّی ہو گئی تو اس نے خادم کو آواز دی "ذرا کھانا اور برتن اٹھا کر لے جاؤ" مہمان جو ابھی تک سیر نہیں ہوا تھا، کھانا اٹھا لینے کا حکم سن کر جھلا کر رہ گیا اور دل ہی دل میں اعرابی کو برا بھلا کہنے لگا، اعرابی اسکی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا "اللہ تجھے خوش رکھے! جو کچھ تو نے کہا، ذرا دوبارہ بتانا" مہمان برا سا منہ بنا کر بولا "جی! آپ پوچھتے جایئے"۔

اعرابی: میرے کتے کا کیا حال ہے؟

مہمان: آپ کا کتا تو مر گیا ہے۔

اعرابی: (حیران ہو کر) کیسے؟

مہمان: آپ کے اونٹ کی کوئی ہڈی اس کے حلق میں پھنس گئی تھی۔

اعرابی: (حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر) کیا میرا اونٹ بھی مر گیا ہے؟

مہمان: ہاں، وہ بھی مر گیا ہے۔ اعرابی: وہ کیسے؟

مہمان: عمیر کی ماں کی قبر کے لئے پانی کی ضرورت تھی، جسے بار بار ڈھونے کی وجہ سے بے چارہ جان سے ہی چلا گیا۔

اعرابی: (چلاتے ہوئے) کیا عمیر کی ماں بھی چل بسی؟

مہمان: (سرد آہ بھرتے ہوئے) بے چاری محبت کی ماری ماں، بیٹے کی جدائی کا غم آخر کب تک برداشت کرتی۔

اعرابی: (بھرائی ہوئی آواز میں) کیا میرا بیٹا بھی دنیا میں نہیں رہا؟

مہمان: ہائے افسوس! وہ غریب تو مکان تلے ہی دب گیا تھا۔

اعرابی: (سر پکڑ کر) کیا میرا مکان بھی گر گیا ہے؟

مہمان: افسوس! تمہارا مکان بھی گر گیا ہے؟

یہ سن کر اعرابی نے ڈنڈا اٹھایا اور اس کے پیچھے دوڑا تو وہ دروازے سے نکل چکا تھا۔

(...... ص،۱۸۷)

......دل کو جلاتا ہے

ایک کنجوس شخص روٹی اور شہد لیکر کھانے بیٹھا تو عین اسی وقت دروازے پر کوئی مہمان آدھمکا، کنجوس نے روٹی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور پھر اس سے پہلے کہ وہ شہد بھی غائب کرتا، مہمان دروازہ کھول کر اندر آ پہنچا، مہمان کے بیٹھ جانے کے بعد کنجوس نے کہا، ”روٹی کے بغیر آپ شہد چاٹنا پسند کریں گے؟“ مہمان نے کہا، ”کیوں نہیں“۔ پھر آؤ دیکھا، نہ تاؤ، انگلیوں سے شہد چاٹنا شروع کر دیا۔ کنجوس شخص اسے یوں بے دردی سے شہد کا صفایا کرتا دیکھ کر ضبط نہ کر سکا اور بول پڑا ”آپ کو معلوم ہے کہ خالی شہد دل کو جلاتا ہے“ مہمان نے برجستہ جواب دیا، ”جی ہاں! مگر آپ کے دل کو“۔

(............ ص‘۱۹۵)

خاندانی مزاج کا اثر

ایک شخص اپنا قصہ بیان کرتا ہے کہ ”ایک مرتبہ میں سفر پر نکلا تو راستہ بھٹک کر ایک جنگل میں جا نکلا، اچانک میری نظر ایک جھونپڑی پر پڑی تو میں وہاں چلا آیا، جھونپڑی میں ایک عورت تھی، اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا ”کون ہو تم؟“ میں نے کہا ”ایک مسافر

مہمان ہوں'' یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئی کہنے لگی ''اللہ تعالیٰ آپ کا آنا مبارک کرے، آیئے! تشریف رکھیئے!'' میں گھوڑے سے اتر آیا، اس نے میرے سامنے کھانا پیش کیا، میں عورت کی مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا، ابھی میں کھانا کھا کر فارغ ہی ہوا تھا کہ اتنے میں اس کا شوہر آپہنچا، اس نے غصیلی نگاہوں سے مجھے گھورا اور کرخت لہجے میں پوچھا ''کون ہو تم؟'' میں نے کہا، ''ایک مسافر مہمان ہوں'' یہ سن کر وہ ناک بھوں چڑھا کر کہنے لگا، ''مہمان ہو تو یہاں کیا کرنے آئے ہو؟ ہمارا کسی مہمان سے کیا کام''۔ میں اس کی یہ بدمزاجی برداشت نہ کر سکا، اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوا اور چل دیا۔

مجھے اس جنگل، بیابان کی خاک چھانتے ہوئے دوسرا دن ہو چلا تھا، آج پھر مجھے اس ویرانے میں ایک جھونپڑی نظر آئی، میں قسمت آزمائی کرنے چلا آیا، دیکھا تو یہاں بھی ایک عورت تھی، اس نے پہلے تو مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر بولی ''کون ہو تم؟'' میں نے جواب دیا ''ایک مسافر مہمان ہوں'' وہ جل بھن کر کہنے لگی ''ہونہہ! مہمان ہو تو یہاں ہمارے پاس کیا لینے آئے ہو، جاؤ اپنا راستہ ناپو'' ابھی وہ اپنی جلی کٹی سنا رہی تھی کہ اس کا شوہر آگیا، اس نے ایک نظر مجھے دیکھا، پھر اپنی بیوی سے مخاطب ہوا ''کون ہے یہ؟'' بیوی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا ''کوئی مسافر مہمان ہے'' یہ سن کر اسکا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا، اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا، کہنے لگا، ''آپ کی آمد مبارک، آپ ہمارے لئے اللہ کی رحمت بن کر آئے ہیں'' پھر اس نے مجھے عزت و احترام سے بٹھایا، نہایت ہی عمدہ کھانا لے کر آیا، میں کھانا کھا ہی رہا تھا کہ مجھے گذشتہ روز کا واقعہ یاد آ گیا اور بے اختیار میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی، اس شخص نے مجھے مسکراتے دیکھا تو پوچھا ''آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟'' میں نے اس کے سامنے گذشتہ روز کا واقعہ بیان کیا اور دونوں میاں، بیوی کا متضاد سلوک کا بھی ذکر کیا، یہ سن کر وہ شخص ہنس دیا، بولا، ''وہ عورت جس سے گذشتہ روز آپ کا واسطہ پڑا تھا، میری بہن ہے اور اس کا شوہر جس کی بداخلاقی کی آپ شکایت کر رہے ہیں، میری اس بیوی کا بھائی ہے، یقیناً ہر شخص پر اس کے خاندانی مزاج کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

(……ص:۱۸۸)

قدرت اللہ شہاب مشہور بیورو کریٹ اور ایک زمانہ میں وہ پاکستان کے صدر ایوب خان کے مصاحب خاص بھی رہے ہیں، وہ صاحب طرز ادیب بھی تھے، انھوں نے اپنی آپ بیتی "شہاب نامہ" کے نام سے لکھی ہے، "شہاب نامہ" اردو کی مقبول کتابوں میں سے ایک ہے، یہاں اس سے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

جس مقام پر اب منگلا ڈیم واقع ہے، وہاں پر پہلے میر پور کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شہر کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیپ میں بٹھائے، اس کے گرد و نواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے، دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے، انہوں نے اشارے سے ہماری جیپ کو روک کر دریافت کیا۔ "بیت المال کس طرف ہے؟" آزاد کشمیر میں خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا "بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے" بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا:

> "میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میر پور شہر کے ملبے کو کرید کرید کر سونے چاندی کے زیورات کی دو بوریاں جمع کی ہیں اب انہیں اس کھوتی پر لاد کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جارہے ہیں"

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور بوریوں کو جیپ میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھالیا، تاکہ انہیں بیت المال لے جائیں۔ آج بھی جب وہ نحیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہئے تھا کہ میں ان

کے گرد آلود پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ بیٹھوں، ایسے پاکیزہ سیرت لوگ پھر کہاں ملتے ہیں؟ اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر۔

بادشاہ لوگ

ایک دفعہ رفیع گنج کے تھانیدار کو ہمراہ لے کر میں ایک نہایت دور افتادہ علاقے کے دورے پر گیا، یہ مقام مکھیوں اور مچھروں کے لئے مشہور تھا، اس لئے ہم دونوں اپنی اپنی مچھر دانی ساتھ لے کر گئے تھے۔ رات کو ہم دونوں نے جس چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا۔ وہاں چارپائیاں تو تھیں لیکن مچھر دانیاں لگانے کے لئے کسی قسم کے ڈنڈے موجود نہ تھے، مجبوراً مچھر دانی لگائے بغیر میں سامنے والے برآمدے میں لیٹ گیا۔ اور تھانیدار نے اپنی چارپائی پچھلے برآمدے میں بچھالی، لیٹتے ہی مٹر کے دانوں کی طرح موٹے موٹے مچھروں نے چاروں طرف سے زبردست یورش کردی۔ وہ قطار در قطار پیں پیں کرتے ہوئے آتے تھے اور اس قدر بے رحمی سے کاٹتے تھے جیسے کوئی دہکتے ہوئے انگارے چمٹے سے اٹھا اٹھا کر سل رہا ہو۔ مچھروں کے حملوں سے میرا تو برا حال ہو رہا تھا۔ لیکن عقبی برآمدے سے برابر تھانیدار کے پرسکون خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔ آدھی رات کے قریب میں نے دبے پاؤں اٹھ کر اس کی طرف جھانکا تو دیکھا کہ تھانیدار صاحب کی چارپائی پر ان کی مچھر دانی بڑی آن بان سے تنی ہوئی ہے اور چار مقامی چوکیدار اسے چاروں کونوں سے تھامے بالکل بے حس و حرکت پتھر کے ستونوں کی طرح ایستادہ ہیں۔

(شہاب نامہ ص:۱۹۸)

وطن پرست

صدر ایوب کے اقتدار کے آخری چند برسوں میں یہاں پر امریکہ کے جو سفیر متعین تھے، ان کا اسم گرامی "بی ایچ اوہلرٹ" تھا۔ ایک روز راولپنڈی میں ایک استقبالیہ سے فارغ ہو کر ہم اپنی اپنی گاڑیوں کا انتظار کر رہے تھے، مسٹر اوہلرٹ کی گاڑی پہلے آگئی، انہوں

نے اصرار کر کے اسلام آباد جانے کے لئے مجھے اپنی کار میں بٹھالیا۔ جتنا عرصہ ہم مری روڈ سے گذرتے رہے، وہ پاکستانی سڑکوں پر ٹریفک اور پیدل چلنے والوں کے رنگ ڈھنگ پر طرح طرح کی پھبتیاں کستے رہے، موٹروں، بسوں، رکشاؤں اور سکوٹروں کے ہجوم میں بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھٹکنے والے راہگیروں کو وہ تمسخر اور تکبر سے BIPEDS (دوپایہ مخلوق) کے لقب سے نوازتے تھے، فیض آباد چوک پر پہنچ کر جب ہم شاہراہ اسلام آباد کی طرف مڑنے والے تھے تو مسٹر اوہلرٹ نے اچانک اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے اور اپنا سر گھٹنوں میں دے کر سیٹ پر جھک گئے، مجھے یہی خیال آیا کہ ان کی آنکھ میں کوئی مچھر یا مکھی گھس گئی ہے اور بے چارے سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ میں نے ازراہ ہمدردی ان سے دریافت کیا "آپ خیریت سے تو ہیں" مسٹر اوہلرٹ نے اپنی گاڑی ایک طرف رکوائی اور پھیکے لہجے میں بولے:

"میں بالکل خیریت سے نہیں، کس طرح خیریت سے ہو سکتا ہوں؟ وہ دیکھو! انہوں نے اس طرف اشارہ کر کے کہا، وہ دیکھو آنکھوں کا خار، میں جتنی بار ادھر سے گزرتا ہوں میری آنکھوں میں یہ کانٹا بری طرح کھٹکتا ہے"۔

میں نے باہر کی طرف نظر دوڑائی تو چوراہے میں ایک بڑا سا اشتہاری بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر پی آئی اے کا رنگین اشتہار دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ اس اشتہار میں درج تھا:

"پی، آئی، اے سے پرواز کیجئے اور چین دیکھیے"

(شہاب نامہ: ص، ۹۶۲)

دیکھا آپ نے امریکی سفیر کی وطن پرستی کو کہ چین کی طرف پی، آئی، اے کی پرواز کا اشتہار اس کی نظروں میں کانٹا بن کر کھٹک رہا تھا کہ اس سے پاک چین دوستی بڑھے گی اور امریکی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔

☆☆☆☆

......ابھی چمک باقی ہے

قیام پاکستان کے بعد حکومت نے ثقافتی صنعت سے وابستہ اداروں اور شخصیات کو بھارت میں ان کی غیر منقولہ جائیداد کا معاوضہ دینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے ایک بورڈ تشکیل دیا، قدرت اللہ شہاب اس بورڈ کے کارکن تھے، وہ لکھتے ہیں:

ایک سرکس والے نے اپنے شیر کا معاوضہ مانگا تھا، جسے وہ بھارت چھوڑ آیا تھا۔ بورڈ کے ممبروں نے اسے بتایا کہ ہم تو صرف غیر منقولہ جائداد کا معاوضہ دیتے ہیں، شیر تو چلتا پھرتا متحرک درندہ ہے، اس کا معاوضہ دینا بورڈ کے اختیار میں نہیں، سرکس والے نے برجستہ جواب دیا "صاحب، شیر تو پنجرے میں بند رہتا ہے، پنجرہ تو غیر منقولہ ہے"۔

ایک صاحب پانچ تانگے بھارت چھوڑ آئے تھے اور ان کے عوض کسی فیکٹری کے طلبگار تھے، ان سے بھی یہی کہا گیا کہ تانگے غیر منقولہ جائداد کے شمار میں نہیں آتے، اس لئے ہمارا بورڈ ان کا معاوضہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا، اس پر درخواست دھندہ نے کہا "جناب، میرے تانگے غیر منقولہ تھے، کیونکہ میں ان میں گھوڑے نہیں جوتتا تھا"۔

ایک شخص، محمد دین نے ضلع لدھیانہ کے کسی گاؤں میں آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہوئی تھی، اس نے اس کی مالیت دو ہزار دو سو روپے درج کی ہوئی تھی، مشین خریدنے کی اصل رسید بھی درخواست کے ساتھ منسلک تھی، ہمارا بورڈ پانچ ہزار روپے سے زیادہ مالیت کے اثاثوں کا فیصلہ کرتا تھا، میں نے محمد دین سے کہا کہ اگر اس نے اپنی مشین کی قیمت دو ہزار دو سو کی جگہ پانچ ہزار روپے درج کی ہوتی تو بورڈ اسے

ضرور معاوضہ دے دیتا کیونکہ اس کے کاغذات بڑے صاف اور سچے ہیں۔

اس نے جواب دیا، ''اچھا میری قیمت ہی دو ہزار دو سو ہے تو میں پانچ ہزار کیسے لکھ دیتا''۔

میں نے کہا، ''تم نے یہ مشین آٹھ برس پہلے خریدی تھی، اب تو قیمتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب تو اس کی قیمت پانچ ہزار سے اوپر ہو گی''۔

محمد دین ہنسا، ''صاحب! آپ بھی بڑے بھولے ہیں، پرانی ہو کر تو مشین کی قیمت گھٹتی ہے، بڑھا نہیں کرتی''۔

محمد دین کو ہم کچھ نہ دے سکے لیکن وہ ہمیں بہت کچھ دے گیا، صبح سے لے کر شام تک ہمارے بورڈ کو جھوٹ، فریب اور لالچ کے جس طوفان بے تمیزی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس ماحول میں محمد دین جیسے انسان، دیانت، امانت اور پاکیزگی کے وہ ستون تھے، جن کی برکت سے قومیں زندہ رہتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔''

(شہاب نامہ ص:۶۲۹، ۶۳۰)

اخلاقی انحطاط کے زوال پذیر معاشرہ میں محمد دین جیسے لوگوں کو دیکھ کر ڈھارس بندھتی ہے کہ۔

ابھی کلیوں میں چٹک ، گل میں مہک باقی ہے
دل میں رونق ، ابھی آنکھوں میں چمک باقی ہے

☆☆☆☆

کردار کا غازی

مولانا غازی احمد صاحب ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے، تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے اسلام قبول کیا، ان کے والدین اور سارا خاندان متعصب ہندو تھے، جس کی وجہ سے انہیں بڑی تکالیف سہنا پڑیں، انہوں نے اسلام قبول کرنے اور اپنی زندگی کی ایمان افروز داستان "من الظلمت الی النور" کے نام سے لکھی ہے، جس کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جب ہندو ۱۹۴۷ء میں بھارت ہندوستان منتقل ہو رہے تھے، اس زمانے کا وہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لوگ جب کیمپ میں منتقل ہو رہے تھے تو میری خالہ نے والدہ صاحبہ کی وساطت سے ایک بوری میں لپٹا ہوا کچھ مال میرے پاس بطورِ امانت رکھا کہ اگر ہم چکوال کیمپ میں زندہ بچ گئے تو اپنا مال واپس لے لیں گے، اگر ہم مارے گئے تو یہ مال تمھارے کام آئیگا۔ میں نے کہا "خالہ جان! اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھیں، میں مال کا طالب نہیں ہوں" میں نے یہ مال صوفی جان محمد صاحب کو بتایا اور سامان ان کے گھر رکھ دیا، ایک روز میں نے صوفی صاحب سے کہا "دیکھیں تو سہی بوری میں کیا ہے"...... جب کھول کر دیکھا تو کپڑے میں تقریباً دو سیر سونا ۸۰ پونڈ اور تقریباً بیس بائیس سیر چاندی تھی، مال کو اسی طرح باندھ کر بوری میں لپیٹ دیا گیا۔ ایک دن شام کے وقت اطلاع ملی کہ صبح چکوال سے ایک اسپیشل ٹرین کیمپ والوں کو لے کر انڈیا جا رہی ہے، مجھے فوراً امانت کا خیال آیا، صوفی صاحب بھی گھر پر نہ تھے، اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے امانت کو سائیکل پر باندھا اور چکوال

روانہ ہو گیا، سورج غروب ہو چکا تھا،اس دور میں راستہ بھی غیر محفوظ تھا۔ چکوال کے راستے میں ایک دو جگہ سکھوں کی لاشیں دیکھ چکا تھا مگر ضمیر کی آواز تھی کہ جلد چکوال پہنچ کر امانت خالہ کے حوالے کروں ،عشاء کے وقت کیمپ میں پہنچ گیا، فوجی حضرات نے پوچھا، دیر سے آئے ہو، میں نے کہا ایک ضروری کام تھا، جب میں کیمپ میں داخل ہوا تو میری خالہ اور خالو بہت خوش ہوئے کہ بھگوان کی دیا سے ہمارا مال پہنچ گیا ہے۔ کیمپ کے ہندو حضرات جمع ہو گئے، میں نے سائیکل سے امانت کھول کر خالو صاحب کے حوالے کی کہ اپنا مال دیکھ لیں، تمام حضرات میری دیانت داری پر بہت خوش ہوئے، ایک صاحب فرمانے لگے "ہندو خون ہے، دیانت داری کیوں نہ ہو" میں نے کہا، "جی حضرت آپ غلط کہہ رہے ہیں اگر میں مسلمان نہ ہوتا تو یہ مال کب کا ٹھکانے لگ چکا ہوتا، اسلام نے مجھے سکھایا ہے کہ امانت میں خیانت قبیح ترین جرم ہے، حق دار کو اس کا حق صحیح و سالم واپس کرو، خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان تھا اور آپ کا یہ حق واپس کر رہا ہوں" وہ صاحب کہنے لگے "اگر تمام مسلمان تمہاری طرح ہوتے تو شاید ہمیں اپنا حق اور علاقہ چھوڑ کر نہ جانا پڑتا" والدہ صاحبہ بہت خوش تھیں کہ تو نے میری عزت میں اضافہ کر دیا، میں خود بھی امانت واپس کر کے بہت خوش تھا کہ الحمدللہ میں نے بد دیانتی کا ارتکاب کر کے اسلام کے مقدس دامن کو داغدار نہیں کیا، اللہ تعالی مجھے حرام رزق سے بچائے۔

(من الظلمات الی النور، ص: ۱٦٠)

☆☆☆☆

درویش صفت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

"دلی پہنچنے کے بعد مولانا نے ابتداءً قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مہمان خانہ واقع قرول باغ میں کیا تھا، یہ جگہ میرے پڑوس میں تھی۔ اس لئے مغرب کے بعد اکثر مولانا کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی۔ ایک دن میں مولانا کی خدمت میں حسبِ معمول حاضر ہوا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ جب میں رخصت ہوا تو مولانا بھی ساتھ باتیں کرتے ہوئے کمرہ سے نکل آئے اور سڑک پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں دیکھا کہ ایک بڑی موٹر کار ہمارے پاس آکر رکی اور موٹر کا دروازہ کھلا تو اس میں سے کراچی کے سیٹھ عبداللہ ہارون باہر نکلے۔ انہوں نے مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ مولانا کراچی میں ایک ضروری کام ہے جس کے لئے آپ کو میرے ساتھ کراچی چلنا ہوگا، مولانا نے پوچھا "کب" سیٹھ صاحب نے کہا "بس ابھی"۔ سیٹھ صاحب کا یہ کہنا تھا کہ مولانا فوراً لپک کر ان کے ساتھ موٹر مین بیٹھ کر روانہ ہوگئے، نہ کمرہ میں گئے اور نہ وہاں سے کوئی چیز لی اور نہ کمرہ کا دروازہ بند کیا، میں ان کے اس انداز پر حیران رہ گیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا اگر کمرہ میں واپس جاتے بھی تو لیتے کیا۔ وہاں ان کا سامان تھا ہی کیا؟ وہاں جو بستر پڑا ہوا تھا یا کچھ برتن رکھے ہوئے تھے وہ جامعہ کے مہمان خانہ کے تھے، مولانا کا کچھ نہ تھا۔"

قرول باغ کے مہمان خانہ میں چند روز قیام فرمانے کے بعد

مولانا جامعہ نگر اوکھلا میں منتقل ہو گئے، اس زمانہ میں مولانا کا معمول یہ تھا کہ جمعہ کی نماز پابندی کے ساتھ اوکھلے سے آکر دلی کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے، اس سلسلہ میں ایک مرتبہ کیا ہوا؟ مولانا سندھی حسبِ معمول اوکھلے سے دِلی آئے، جامع مسجد میں نماز جمعہ ادا کی اور پھر ادارہ شرقیہ میں تشریف لا کر حسبِ معمول "حجۃ اللہ البالغۃ" کا درس دیا، اس وقت چہرہ پر نہ تھکان کا کوئی اثر اور نہ آواز میں کسی قسم کا اضمحلال اور ضعف' کمال بشاشت اور توانائی سے تقریر کی اور اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی پوری توجہ اور حاضر حواسی کے ساتھ حصہ لیا۔ اتنے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو ہم سب کے ساتھ نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا رخصت ہو گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی ضرورت سے پتلی قبر کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا ایک بھٹیارہ کی دکان پر کھانا کھا رہے ہیں۔ کھانا بہت معمولی یعنی دو آنہ کا سالن اور ایک آنہ کی روٹی، میں نے کہا' حضرت بے وقت کھانا کیسا؟ فرمایا "اوکھلے میں کھانا تیار نہ تھا اگر انتظار کرتا تو جامع مسجد میں نماز نہ پڑھ سکتا۔ اس لئے کھانا کھائے بغیر ہی چلا آیا تھا"۔ یہ تو خیر ہوا ہی، اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس واقعہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، یہ گرمیوں کے کسی مہینہ میں پیش آیا تھا۔ اور چونکہ مولانا کے پاس اوکھلے اور دلی کی آمد و رفت کے لئے بس کا کرایہ ادا کرنے کے واسطے پیسے نہ تھے، اس لئے اس روز مولانا سخت تپش اور گرمی کے عالم میں اوکھلے سے دلی آٹھ میل پاپیادہ آئے اور اسی طرح آٹھ میل پاپیادہ واپس تشریف لے گئے۔ اس کے متعلق بھی مولانا نے خود ہم سے کچھ کہا اور نہ چہرہ دیکھ کر کوئی سمجھ سکا بلکہ جامعہ نگر کے ایک صاحب نے جو بس میں سفر کر رہے تھے، مولانا

کو پیدل آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ان سے جب مجھ کو یہ معلوم ہوا تو میں نے مولانا سے دریافت کیا اور مولانا نے اس کی تصدیق کی تو اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ اس روز مولانا کو پیدل آنا تھا، اس لئے دلی میں اوکھلے سے ان کو بہت پہلے روانہ ہونا تھا۔ اور چونکہ اس وقت تک کھانا تیار نہ ہوا تھا، اس لئے دلی میں عصر کے بعد کھانا کھایا اور چونکہ جیب میں صرف تین آنہ پیسے تھے جو بس کے کرایہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان پیسوں سے کھانا کھایا اور اوکھلے سے دلی تک کا سفر پیدل کیا۔

(ماہنامہ الولی، رمضان ۱۴۱۰ھ، ص ۲۵......۲۶)

دنیا میں کسی کی بھی یکساں نہیں گذری

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

"۱۹۴۶ء کی ابتدا میں جب میں دارالعلوم سے ملازمت کا تعلق منقطع کر چکا تھا اور اپنے شوق سے بعض درجوں میں کچھ اسباق پڑھا دیا کرتا تھا۔ معلوم نہیں کیا خیال پیدا ہوا کہ دارالعلوم کی مسجد سے متصل جو چھوٹا سا مکان تعمیر ہوا تھا۔ اس میں میں نے بھائی صاحب سے ضابطہ کی اجازت لے کر رہنا شروع کر دیا اور والدہ صاحبہ اور گھر والوں کو لے آیا۔ اس وقت معاش کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ کتابوں کے معاوضہ اور نفع کا کوئی سلسلہ۔ یہ سال اقتصادی طور پر سخت پریشانی کا گذرا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ امین آباد کے چوراہے پر نظیر آباد جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر میں نے جیب سے کئی مرتبہ گھڑی نکالی کہ اس کو کسی گھڑی کی دکان پر آدھے پونے دام پر بیچ

دوں، اس سے کچھ دن کام چلے لیکن پھر اس خیال سے ہمت نہیں ہوئی کہ دکان دار کہیں چوری کی نہ سمجھے۔ یہ پورا سال پریشانی میں گذرا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بے برکتی کیوں ہے؟ ایک دن معلوم ہوا کہ بھائی صاحب میرے اس علیحدہ قیام پر بہت مغموم اور متاثر ہیں، ان کو بڑا قلق ہے کہ ان کی زندگی میں میں نے لکھنؤ میں رہتے ہوئے علیحدہ قیام کا انتظام کیا۔ میں نے ان سے رو کر معافی مانگی اور جب کہ تقریباً ایک سال گذر رہا تھا، میں پھر اپنے اسی قدیم مکان میں آگیا، پھر یاد نہیں کبھی ایسی تنگی اور پریشانی پیش آئی ہو۔"

(کاروان زندگی جلد:۱، ص:۳۶۷)

یہ آشیانہ کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

مولانا ولی رازی صاحب اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

دل کی دنیا کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے آج مجھے ایسے ہی ایک بے تاج بادشاہ کی یاد آگئی ہے جسے بچپن میں راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا ہے، یہ صاحب کشف و کرامت بزرگ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے استاد حضرت مولانا اصغر حسین شاہؒ ہیں، جو "حضرت میاں صاحب" کے نام سے مشہور تھے۔ حضرت میاں صاحب کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد تھی جس میں حضرت میاں صاحب نمازیں ادا فرماتے تھے۔ والد صاحبؒ فرماتے تھے کہ مسجد کے راستے میں ایک حویلی نما مکان تھا جس کے دروازے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ حضرت میاں صاحب جب شام کے وقت اس دروازے کے سامنے سے گزرتے تھے تو اپنے جوتے اتار لیتے تھے۔ والد صاحبؒ کو

اس پر حیرت تھی کہ حضرت میاں صاحبؒ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ شروع میں پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ آخر ایک روز موقع دیکھ کر والد صاحبؒ نے پوچھ ہی لیا کہ حضرت! اس مکان میں کون رہتا ہے؟ اور آپ کے جوتے اتارنے کا کیا سبب ہے؟ پہلے تو حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ "میاں کیا کروگے پوچھ کے" پھر کچھ وقفے کے بعد فرمایا کہ، "اس مکان میں ایک پیشہ ور رنڈی رہتی ہے، اب اس کی عمر ڈھل چکی ہے۔ لیکن جب یہ جوان تھی تو یہاں لوگوں کا ہجوم روزانہ رہتا تھا، اور اس مکان میں کافی آمدورفت تھی، اب یہ بے چاری روزانہ شام کو بن سنور کر بیٹھتی ہے اور انتظار کرتی ہے کہ کوئی آئے، سو مجھے خیال آیا کہ شام کو جو لوگ اس کے دروازے سے گزرتے ہوں گے، ان کے جوتوں کی چاپ سن کر اس کو ایک امید پیدا ہوتی ہو گی کہ شاید کوئی اس کے پاس آیا اور پھر جب یہ چاپ دور ہو جاتی ہو گی تو اس کی امید ٹوٹتی ہو گی تو میاں! ہم کیوں کسی کی ناجائز امید پیدا کرنے اور پھر اس کو توڑنے کا سبب بنیں، ہماری پڑوسن ہے۔ اپنی ذات سے اس کو تکلیف دینا تو صحیح نہیں" ذرا سوچئے ان اللہ والوں کی نظر کتنی باریک ہے، کہاں نظر پہنچی؟ پڑوسی کے حقوق کی بات تو سب ہی نے پڑھی ہے، لیکن اس وقت نظر کے ساتھ پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھنا صرف اہل دل کا حصہ ہے اور واللہ یہ فہم و نظر دل کی صفائی اور ٹیوننگ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی"۔

ان اللہ والوں کی زندگی صحیح معنوں میں اس شعر کا مصداق تھی ؎

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
یہ آشیانہ کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

دردوالم سے بے نیاز میں محوجمالِ یار ہوں

حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ مشہور دینی مدرسہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی اور حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، ان کی زندگی کا ایک غیر معمولی واقعہ ان کی ٹانگ کے آپریشن سے تعلق رکھتا ہے، کولہا سے ٹانگ کا آپریشن ہونا ہے۔ پاکستان کے مایہ ناز سرجن ڈاکٹر امیر الدین...... جنہیں ایشیا بھر میں معروف سرجن کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا...... آپریشن کے لئے تیار کھڑے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کا قطعی فیصلہ ہے کہ نہ تو انہیں بے ہوش کرنا ہے اور نہ کسی صورت مقامی طور پر کسی دوائی کا استعمال کرنا ہے، جو اس خاص حصہ کو آپریشن کی تکلیف سے وقتی طور پر بچا سکے، حضرت مفتی صاحب اپنے عقیدت مند ڈاکٹروں...... سرجن امیر الدین اور کرنل ضیاء اللہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں، ”میں کچھ پڑھنا شروع کرتا ہوں، جب یہ ورد ختم ہو جائے تو تم اپنا کام (آپریشن) شروع کر دینا“! اس حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ آپریشن کے دوران حضرت مفتی صاحب بقائمی ہوش وحواس انتہائی پرسکون انداز میں لیٹے ہوئے ہیں۔ سرجن امیر الدین آپریشن میں مصروف ہیں اور کرنل ضیاء اللہ حضرت مفتی صاحب کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ مفتی صاحب نے آپریشن کے دوران ”سی“ تک نہیں کی۔ آپریشن میں تقریباً ایک گھنٹہ لگا۔ آپریشن کے وقت ڈاکٹر کا ہاتھ آپؒ کی نبض پر تھا، اس کا بیان ہے کہ ”حیرت ہے کہ آپریشن کے شروع سے اختتام تک نبض کی رفتار میں سرِ مو فرق نہیں آیا، اس آپریشن کے بعد ایسا تکلیف دہ درد ہوتا ہے کہ اس کی شدت کا پہاڑ جیسے مضبوط دل والا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا مگر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمتہ جس بشاشت کے ساتھ آپریشن کے کمرے میں داخل ہوئے تھے، اسی بشاشت کیساتھ اس طرح واپس ہوئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں“۔

(سوانح مولانا مفتی محمد حسن صاحب، ص:)

احساسِ کمتری

انگریزوں نے غیر منقسم ہندوستان کے باشندوں کو ایک طویل عرصے تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنا غلام بنائے رکھا۔اس کامیابی کا سہرا سول سروس کے سر جاتا ہے، جس کے ارکان کی تعداد ایک وقت میں ہزار ڈیڑھ ہزار سے زیادہ کبھی نہیں رہی، یہ ہزار ڈیڑھ ہزار افراد ہندوستان کے کروڑوں عوام کی قسمت کے مالک تھے۔اس سروس میں زیادہ تر انگریز ہوتے تھے لیکن ایک خاص تعداد میں ہندوستانیوں کو بھی لیا جاتا تھا،یہ کالے انگریز، انگریزوں سے بڑھ کر تاج برطانیہ کے وفادار تھے۔یہی نہیں، بلکہ وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر نادم رہتے تھے،اس لیے نہیں چاہتے تھے کہ انہیں ان کے ماضی کے حوالے سے پہچانا جائے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون ”آئی سی ایس“ میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ایک کالا انگریز اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اس کے والد کمرے میں بے تکلف چلے آئے۔ان کی دیہاتی وضع قطع ایسی تھی کہ صاحب بہادر کو اپنے دوست کے سامنے انھیں اپنا والد بتاتے ہوئے شرم آئی، لہٰذا یہ کہہ کر تعارف کرایا ”یہ میرے والد کے ایک دوست ہیں“......والد محترم کو غصہ آگیا، انھوں نے بیٹے کے دوست کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”میں ان کے والد کا نہیں، والدہ کا دوست ہوں“۔

(خامہ بگوش کے قلم سے ص: ۲۸)

غلامانِ فرنگ

مشہور کالم نگار جاوید چوہدری اپنی کتاب میں پاکستان کے حکمران طبقہ کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

”ذوالفقار علی بھٹو پوری طرح بااختیار تھے تو ایک بار امریکہ کے دورے پر گئے، وہاں بھٹو صاحب کے اعزاز میں پاکستان کے

سفارت خانے نے ڈنر کا پروگرام بنایا، جس کی صدارت کے لیے "ہنری کسنجر" کو دعوت دی گئی، جسے انہوں نے سفارتی عملے کی کوششوں اور بھٹو صاحب کی "کرشماتی شخصیت" سے متاثر ہو کر قبول کر لیا، جو یقیناً پاکستانی حکام کے لیے بڑے "اعزاز" کی بات تھی لہذا، ڈنر سے دو روز قبل سفارت خانے میں "مینو" (کھانوں کی فہرست) تیار کرنے کے لیے اجلاس طلب کیا گیا، جس میں بھٹو صاحب اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں دنیا بھر کے ان تمام کھانوں کا جائزہ لیا گیا، جو ہنری کسنجر کو مرغوب تھے یا جن کے مرغوب ہونے کا امکان تھا۔ کسی نے کہا کسنجر ایک بار حیدر آبادی دال کا بڑا ذکر کر رہے تھے، کسی نے بتایا "بھارتی سفارت خانے کے ایک فنکشن میں انہوں نے بریانی کے پورے دو چمچ لیے تھے" کوئی بولا "ارے صاحب! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کسنجر کیکڑے کے سوپ کے پورے دو پیالے چڑھا گئے۔" وغیرہ وغیرہ لیکن بھٹو صاحب کا اصرار تھا کیونکہ ایک عرصے بعد امریکی برف ٹوٹی ہے، لہذا یہی وقت ہے جب ہم کسنجر کو مٹھی میں لے کر امریکیوں کے دل جیت سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں مینو میں کوئی ایسی حیرت انگیز چیز رکھنی چاہیے، جو کسنجر کی ساری توجہ کھینچ لے۔ بھٹو صاحب کا حکم تھا، لہذا تمام سفارتی دماغ اس اہم نکتے پر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک صاحب نے سر اٹھایا اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولے "کیوں نہ ہم ہنری کسنجر کو کالے بٹیر کھلائیں۔" بس ان لفظوں کا ادا ہونا تھا کہ بھٹو صاحب نے چیخ کر کہا "یس دیٹ از دی سجیشن" اور سب کے چہروں پر روشنی پھیل گئی۔ اس کے بعد واقفان حال بتاتے ہیں، پاکستان کا پورا سفارتی عملہ اور بھٹو صاحب کے وفد کے تمام ارکان امریکہ میں

کالے بیٹروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن رات گئے تک کوشش کے باوجود بٹیر دستیاب نہ ہو سکے۔ پھر کسی "سیانے" نے مشورہ دیا، "جہاز بھیجیں اور کراچی سے جتنے چاہیں بٹیر منگوالیں۔" تجویز اچھی تھی، لہذا وزیر اعظم نے فوراً اس نیک کام کے لیے اپنا طیارہ وقف کر دیا، قصہ مختصر اگلے روز وزیر اعظم کے طیارے پر دو ہزار بٹیر امریکہ آ گئے تو پتہ چلا سفارت خانے کا خانساماں تو "بٹیر" بنانے کا اہل ہی نہیں، اب کیا ہو سکتا تھا، ناچار وزیر اعظم کا طیارہ دوبارہ کراچی آیا اور بٹیر بنانے کا ماہر لے کر واپس واشنگٹن گیا، اگلے روز ڈنر کا دن تھا، چنانچہ سارا دن سفارتی عملہ بٹیر بنانے میں خانساماں کی مدد کرتا رہا۔ شام کو جب "ڈش" تیار ہو گئی تو مینو کارڈ پر اس کا خصوصی طور پر اندراج کیا گیا، جس میں مرحوم بٹیروں کی تمام عادات، خصائل اور فوائد کا نہایت خوبصورت انگریزی میں ذکر تھا۔ بہر حال قصہ مزید مختصر، رات کو جب ہنری کسنجر نے "پاکستان ہاؤس" میں قدم رنجہ فرمایا تو بھٹو صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے "مسٹر پرائم منسٹر! میں بہت مصروف ہوں، آپ لوگوں کو صرف پندرہ منٹ کمپنی دے سکوں گا، آیئے! کھانے کی میز پر ہی گپ لگاتے ہیں۔ سب نے فوراً گردن ہلا کر ان کی تائید کی جس کے بعد معزز مہمان ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔ سب سے پہلے کسنجر کے سامنے مینو رکھا گیا، جو انہوں نے بغیر پڑھے گلاس کے نیچے رکھ دیا، پھر بٹیروں کی ٹرے ان کے سامنے لائی گئی، جسے دیکھ کر انھوں نے "نو تھینکس" کہا اور سلاد کی پلیٹ سے "کھیرے" کی چند قاشیں اٹھا کر بھٹو صاحب کا "حال چال" پوچھنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان کی سیکرٹری آگے بڑھی اور نہایت احترام سے پوچھا: "سر ہمارے لیے کیا حکم ہے؟" کسنجر

نے فوراً گھڑی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بھٹو صاحب سے بولا "تھینک یو ویری مچ پرائم منسٹر، وی ول میٹ سون" کرسی کھسکائی اور ہاتھ ہلاتا ہوا، دروازے سے باہر نکل گیا۔

(زیرو پوائنٹ، ص:۱۲۰۔۱۲۱)

بزرگوں کے جوابات عجیب ہوتے ہیں

حضرت تھانویؒ نے ایک مولوی صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا:

"اعتراض کر دینا کون سا مشکل ہے، مشکل تو کام کرنا ہے، یا کام کی بات کہنا، یا اس کا سمجھنا، میری تصانیف پر رات دن عنایت فرما اعتراضات کرتے رہتے ہیں، چنانچہ "حفظ الایمان" کی عبارت پر اعتراض ہے، حالانکہ اس کی عبارت بالکل صاف اور اس کا مفہوم بالکل بے غبار ہے، لیکن عناد اور بغض وحسد کا کسی کے پاس کیا علاج؟

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کی عبارت پر اعتراض ہے۔ وہ عبارت یہ ہے کہ "اگر خدا چاہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سینکڑوں بنا ڈالے" یہ ایک بڑا اعتراض ہے جس پر مخالفین کو ناز ہے کہ اس کا جواب نہیں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ نے ایک مولوی صاحب کو اس عبارت پر اعتراض کرنے کے وقت جو جواب دیا تھا، وہ عجیب وغریب ہے، اور بزرگوں کے جوابات ہوتے ہی عجیب ہیں، مناظرین کا ذھن وہاں تک نہیں پہنچتا۔ ان مولوی صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ حضرت اسماعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان میں اس عنوان سے ایک عبارت لکھی ہے

کہ ''اگر خدا چاہے تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے سینکڑوں بناڈالے'' اور محاورہ میں صیغہ ''بناڈالے'' تحقیر کا ہے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی تحقیر ہے اور یہ کفر ہے، حضرت مولانا نے جواب میں فرمایا کہ تحقیر تو ہے مگر فعل کی تحقیر ہے، مفعول کی نہیں ''بنانے'' کی تحقیر ہے یعنی بنانا سہل ہے، عظیم اور ثقیل نہیں، کہنے لگے، حضرت یہ تو تاویل ہے، فرمایا ''بہت اچھا! اگر تاویل ہے، جانے دیجئے'' یہ حضرات عجیب شان کے تھے، کسی بات کے پیچھے نہ پڑتے تھے، بڑے ظرف کے لوگ تھے، کسی بات کے درپے نہ ہوتے تھے، اتفاق سے دو تین ہی روز کے بعد یہی اعتراض کرنے والے مولوی صاحب مولانا سے عرض کرنے لگے کہ ''حضرت مشکوۃ شریف، ترمذی شریف تو آپ کے یہاں چھپ چکیں، اب بیضاوی شریف بھی چھاپ ڈالئے'' مولانا نے فوراً فرمایا کہ ''مولوی صاحب! یہ وہی ''ڈالنا'' ہے جس کی تحقیر کفر ہوتی ہے، آپ نے بیضاوی شریف کی تحقیر کی جو مشتمل ہے قرآن پاک پر اور کل کی تحقیر جز کی تحقیر ہے اور قرآن پاک کی تحقیر کفر ہے، آپ بتائیے، وہی کفر کا فتویٰ آپ پر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس وقت ...... مولوی صاحب کی آنکھیں کھلیں اور عرض کیا کہ حضرت واقعی اس کا مطلب اور مفہوم تو خود میرے ذہن میں وہی تھا، کہ آپ کے پاس سامان موجود ہے، آپ کو چھاپ دینا آسان ہے، فعل ہی کی تحقیر تھی، مفعول کی نہ تھی۔''

(البلاغ محرم الحرام ۱۴۲۰ھ ص: ۲۷)

☆☆☆☆

مہربان کیسے کیسے؟

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ حضرت مدنی کے بارے میں فرماتے ہیں:

"میں نہ مولانا کا شاگرد ہوں، نہ مرید، نہ پیر بھائی، ان کے مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے مجھے ان سے محبت و عقیدت ہو گئی تھی، میں ایک مرتبہ لکھنؤ سے گاڑی پر سوار ہوا، میری طبیعت خراب تھی، چادر اوڑھ کر سیٹ پر لیٹ گیا، بخار تھا، اعضاء شکنی تھی، اس لئے کراہتا بھی تھا، مجھے نہیں معلوم کہ کون سا اسٹیشن آیا اور کون مسافر سوار ہوا، بریلی کے اسٹیشن کے بعد ایک شخص نے میرے پاؤں اور کمر دبانا شروع کی، مجھے بہت راحت ہوئی، چپکا لیٹا رہا اور وہ دباتا رہا، مجھے پیاس لگی، پانی مانگا تو اس نے اپنی صراحی سے گلاس پانی کا دیا اور کہا "لیجئے" میں نے اٹھ کر دیکھا تو مولانا مدنیؒ تھے، مجھے ندامت ہوئی اور معذرت کی لیکن انہوں نے اس درجہ مجبور کیا کہ پھر لیٹ گیا اور وہ رامپور تک برابر مجھ کو دباتے رہے، پھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔"

(ماہنامہ الرشید مدنی و اقبال نمبر، ص:۱۷۲)

اخلاق کا اثر

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے روایت ہے کہ جب حضرت مدنی رحمہ اللہ آخری حج سے تشریف لا رہے تھے تو ہم لوگ اسٹیشن پر شرف زیارت کے لئے گئے۔ حضرت کے متوسلین میں سے ایک صاحب زادہ محمد عارف ضلع جھنگ دیوبند تک ساتھ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ ٹرین میں ایک ہندو جنٹلمین بھی تھا جس کو ضرورت فراغت لاحق

ہوئی، وہ رفع حاجت کے لئے گیا اور الٹے پاؤں بادل ناخواستہ واپس ہوا۔ حضرت مولانا مدنیؒ سمجھ گئے۔ فوراً چند سگریٹ کی ڈبیاں ادھر ادھر سے اکٹھی کیں، لوٹا لے کر پاخانہ میں گئے اور اچھی طرح صاف کر کے ہندو دوست سے فرمانے لگے کہ "جایئے پاخانہ بالکل صاف ہے" نوجوان نے کہا "مولانا، میں نے دیکھا ہے، پاخانہ بالکل بھرا ہوا ہے" قصہ مختصر، وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا، بہت متاثر ہوا اور بھرپور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا "یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے"۔

اس واقعہ کو دیکھ کر خواجہ نظام الدین تونسوی مرحوم نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ "یہ کھدر پوش کون ہے؟" جواب ملا کہ "یہ مولانا حسین احمد مدنیؒ ہیں" تو خواجہ صاحب مرحوم بے اختیار ہو کر حضرت مدنیؒ کے پاؤں سے لپٹ گئے اور رونے لگے، حضرت نے جلد پاؤں چھڑائے اور پوچھا، کیا بات ہے؟ تو خواجہ صاحب نے کہا "سیاسی اختلاف کی وجہ سے میں نے آپ کے خلاف فتوے دیئے اور برا بھلا کہا، آج آپ کے اس اعلیٰ کردار کو دیکھ کر تائب نہ ہوتا تو شاید سیدھا جہنم میں جاتا" حضرت مدنیؒ نے فرمایا "میرے بھائی! میں نے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنت پر عمل کیا ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک یہودی مہمان نے بستر پر پاخانہ کر دیا تھا، صبح جلدی اٹھ کر چلا گیا جب اپنی بھولی ہوئی تلوار لینے آیا تو دیکھا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم بہ نفس نفیس اپنے دست مبارک سے بستر کو دھو رہے ہیں، یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا"۔

(ماہنامہ الرشید، مدنی واقبال نمبر، ص: ۱۷۲)

پیکر ایثار و ہمدردی

مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے روایت ہے کہ یوپی میں ایک جگہ میری تقریر تھی، رات کو تین بجے تقریر سے فارغ ہو کر لیٹ گیا، ابھی میں نیم غنودگی کی حالت میں تھا کہ مجھ کو محسوس ہوا کوئی میرے پاؤں دبا رہا ہے، میں نے کہا کہ لوگ اس طرح دباتے رہتے ہیں، کوئی مخلص ہوگا، مگر اس کے ساتھ معلوم ہو رہا تھا کہ یہ مٹھی تو عجیب قسم کی ہے، باوجود

راحت کے نیند رخصت ہوتی جا رہی تھی، سر اٹھایا تو دیکھا حضرت شیخ مدنیؒ ہیں، فوراً پھڑک کر چارپائی سے اتر پڑا اور ندامت سے عرض کیا "حضرت! کیا ہم نے اپنے لئے جہنم کا خود سامان پہلے سے کم کر رکھا ہے کہ آپ بھی ہم کو دھکا دے کر جہنم بھیج رہے ہیں" شیخ نے جواباً فرمایا "آپ نے دیر تک تقریر کی تھی، آرام کی ضرورت تھی اور آپ کی عادت بھی تھی اور مجھ کو سعادت کی ضرورت، ساتھ ہی نماز کا وقت قریب تھا، میں نے خیال کیا آپ کی نماز نہ چلی جائے تو بتایئے حضرت میں نے کیا غلطی کی ہے"۔

(......، ص: ۱۷۳)

نرالی ٹوک

مولانا عبداللہ فاروقیؒ حضرت رائے پوریؒ سے بیعت تھے، لاہور دہلی مسلم ہوٹل میں برسہا برس خطیب رہے، ان کا بیان ہے کہ میں مدینہ منورہ حاضر ہوا اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے پاس قیام کیا، ایک روز جب مولانا کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کے لئے گیا تو میں نے مولانا کا جوتا اٹھالیا، مولانا اس وقت تو خاموش رہے، دوسرے وقت جب ہم نماز پڑھنے کے لیے گئے تو مولانا نے میرا جوتا اٹھا کر سر پر رکھ لیا، میں پیچھے بھاگا، مولانا نے تیز چلنا شروع کر دیا، میں نے کوشش کی کہ جوتا لے لوں لیکن نہیں لینے دیا میں نے کہا کہ "خدا کے لئے سر پر تو نہ رکھئے" فرمایا کہ "عہد کرو کہ آئندہ حسین احمد کا جوتا نہ اٹھاؤ گے" میں نے عہد کر لیا، تب جوتا سر پر سے اتار کر نیچے رکھا۔

(ماہنامہ الرشید، مدنی واقبال نمبر، ص: ۱۷۴)

حجاج کے ساتھ ایک دیہاتی کی حکیمانہ گفتگو

سعید بن ابی عروبہ کہتے ہیں ایک مرتبہ حجاج بن یوسف حج کے سفر پر نکلا ہوا تھا کہ راستے میں پانی کے ایک چشمے پر قیام کیا اور دربان سے کہا "جاؤ کسی شخص کو تلاش کر کے لاؤ جو ہمارے ساتھ کھانا کھائے اور ہم اس سے کچھ گفتگو بھی کر سکیں" دربان نے ادھر ادھر نظر

دوڑائی تو اسے ایک اعرابی سویا ہوا نظر آیا، آکر پاؤں کی ٹھوکر سے اسے جگایا اور حجاج کے پاس لے آیا، حجاج نے اس سے کہا "ہاتھ دھو کر آؤ اور میرے ساتھ کھانا کھاؤ" اعرابی نے کہا "آج تم سے بہتر ہستی نے مجھے دعوت دے رکھی ہے اور میں اسے قبول بھی کر چکا ہوں" حجاج نے حیران ہو کر کہا، "کس نے تمہیں دعوت دے رکھی ہے؟" اعرابی نے کہا، "اللہ تعالیٰ نے مجھے روزہ رکھنے کی دعوت دی ہے اور میں روزہ رکھ چکا ہوں" حجاج نے کہا "اس قدر گرمی میں؟" اعرابی نے کہا "اس سے بھی زیادہ گرمی میں رکھتا رہا ہوں" حجاج نے کہا "کل رکھ لینا" اعرابی نے کہا "اگر آپ کل تک زندہ رہنے کی ضمانت دیتے ہیں تو ٹھیک ہے" حجاج نے کہا، "یہ تو میرے اختیار میں نہیں" اعرابی نے کہا "تو پھر آپ مجھ سے نقد کے بدلے ایسے ادھار کا مطالبہ کیسے کرتے ہیں جو آپ کے اختیار میں ہی نہیں؟" حجاج نے کہا "یہ کھانا بہت عمدہ ہے" دیہاتی نے کہا "ارے عافیت ہے تو کھانا عمدہ محسوس ہو رہا ہے، اس کی عمدگی عافیت ہی کی بدولت ہے"۔

(عیون الاخبار، جلد:۲، ص:۳۶۹)

دل کا حال

ایک درویش دوسرے درویش سے ملا تو کہنے لگا "میں آپ سے اللہ کے لئے محبت کرتا ہوں" دوسرے نے کہا، "اگر آپ میرے دل کا وہ اصلی حال جان لیں جو میں جانتا ہوں تو مجھ سے بغض کرنے لگیں گے" پہلے نے کہا "آپ کی اندرونی اصلی حالت کا اگر مجھے علم بھی ہو جائے تو جو میں اپنے بارے میں جانتا ہوں وہ آپ کے بغض سے اعراض کرنے کے لئے کافی ہوگا (کہ میری حالت بہرحال آپ سے بدتر ہے)

(......۲، ص.۳۶۷)

☆☆☆☆

غلط فہمی

امین گیلانی اپنی ایک کتاب "غلط فہمی" میں لکھتے ہیں:

"ایک روز میرا ایک "سیانا بیانا" دوست آیا اور ہنس کر کہنے لگا، یار آج میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا، میں فجر کی نماز کے لئے جب مسجد میں داخل ہوا تو جماعت کھڑی ہو گئی، میں نے جلدی جلدی وضو کیا کہ ابھی دو سنتیں بھی پڑھنی ہیں، کہیں جماعت سے رہ نہ جاؤں، وضو کر کے اٹھا، ٹوپی اٹھانے لگا تو ساتھ ہی ایک چمکتی ہوئی گھڑی نظر آئی، میں نے وہ بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لی کہ یقیناً کوئی نمازی یہاں بھول گیا ہے، شیطان نے ورغلایا، بجائے نماز ادا کرنے کے جوتا پہنا اور مسجد سے باہر آگیا، دور جا کر جیب میں ہاتھ ڈال کر گھڑی نکالی کہ دیکھوں قیمتی ہے یا معمولی، جب گھڑی دیکھی تو مارے حیرت کے وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا کہ وہ گھڑی میری اپنی تھی، جو غلط فہمی میں کسی دوسرے کی سمجھ کر لے بھاگا اور نماز بھی نہ ادا کی، اپنے آپ کو لعنت ملامت کی، دل ندامت میں ڈوب گیا، توبہ کی اور واپس آکر تنہا نماز ادا کی اور اللہ میاں سے معافی چاہی، اصل بات یہ ہوئی کہ جماعت میں شامل ہونے کا احساس اتنا شدید تھا کہ یہ بھی ذہن سے محو ہو گیا کہ میں نے ٹوپی کے ساتھ گھڑی بھی اتار کر رکھی تھی"۔ دیکھ لیا غلط فہمی میں انسان کیا کیا حرکتیں کر گزرتا ہے"۔

(غلط فہمی از سید امین گیلانی ص:۲۹)

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انسان مال کا کس قدر حریص ہے، ایک پکے نمازی کی نظر گھڑی پر پڑ گئی اور تقویٰ کا جذبہ دھرا کا دھرا رہ گیا، نماز چھوڑی اور گھڑی لے اڑا، واقعتاً مال کی محبت ایک عظیم فتنہ ہے۔

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ جب تقسیم ہند کے بعد وطن کو خیر باد کہہ کر پاکستان تشریف لائے اور کراچی میں مقیم ہوئے تو اس وقت اس شہر میں دینی تعلیم کا صرف ایک ہی ادارہ تھا یعنی مظہر العلوم کھڈہ، ظاہر ہے کہ وہ تمام اہل علم کو اپنے اندر نہیں سمو سکتا تھا، اس لئے حضرت مفتی ولی حسن صاحبؒ نے اس وقت برنس روڈ پر واقع "میٹرو پولیس ہائی اسکول" میں اسلامیات کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ اسکول کی انتظامیہ انگریزوں کی پروردہ اور مغربی ذہنیت کی حامل تھی، اس نے حضرت مفتی صاحبؒ سے ڈاڑھی منڈوانے کا مطالبہ کیا، ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب مرحوم اس مطالبہ کو تسلیم کرنے والے نہ تھے لیکن انتظامیہ کا اصرار جاری رہا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انتظامیہ نے ڈاڑھی نہ منڈوانے کی صورت میں ملازمت سے علیحدہ کر دینے کا عزم کر کے مولانا کو آخری فیصلہ سنا دیا۔ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ، صاحبِ عیال تھے، اس زمانہ میں کوئی دوسرا ذریعہ معاش بھی نہ تھا، فکر مند ہو کر اپنے رفیق حضرت مولانا نور احمد صاحب (دارالعلوم کراچی کے ناظم اول) کے پاس آئے اور پریشانی کے عالم میں یہ صورت حال بتائی، واقعہ سن کر حضرت مولانا مرحوم کو سخت تکلیف ہوئی اور بڑی غیرت آئی، پوچھا، آپ کو کیا مشاہرہ دیتے ہیں؟ انہوں نے مشاہرہ بتا دیا۔ حضرت مولانا مرحوم نے ان سے فرمایا "آپ ہمارے پاس آ جائیں ہم ان سے دگنا مشاہرہ دیں گے، کل آپ ڈاڑھی میں اہتمام سے کنگھا کر کے تیل لگا کر جائیں اور استعفا پیش کر دیں" چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ استعفا دے کر دارالعلوم کراچی آ گئے اور پاکستان میں اپنی خدمات دینیہ کا وقیع انداز میں آغاز فرمایا۔

(متاع نورؔ از مولانا رشید اشرف صاحب، ص. ۳۱۳)

یہ اس پاکستان کے نظام تعلیم کا واقعہ ہے جس کے وجود کی وجہ جواز ہی ایک خالص اسلامی ریاست کا قیام تھا اور اس کے لئے بر صغیر کے مسلمانوں نے لازوال قربانیاں دیں، ، یہاں حکومتوں کے انقلابات نے اسکی تاسیس کے بلند اہداف و مقاصد کا جو حشر کیا وہ ایک دردناک داستان ہے

بلبل ہمہ تن خون شد و گل شد ہمہ تن چاک　　اے وائے بہارے! اگر این است بہارے

میرے لئے دین عزیز تر ہے

مولانا نور احمد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور دارالعلوم کراچی کے ناظم اول اور بانیوں میں سے تھے، ان کی سوانح حیات ان کے صاحبزادے مولانا رشید اشرف صاحب نے لکھی ہے، وہ ایک رشتے کے سلسلے میں ان کی دینی حساسیت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"راقم الحروف کی ہمشیرہ کا ایک اچھا رشتہ آیا' لڑکا کینیڈا میں تھا، تعلیم یافتہ' خوب رو، حسب نسب اور وجاہت والا، اس کے والدین جو ہمارے بعض واقف کاروں کے رشتہ دار تھے پاکستان میں بہتر سے بہتر رشتہ کے لئے کوشاں تھے، تلاش و جستجو کے بعد نظر انتخاب ہمارے گھرانے پر پڑی' بڑے چاؤ سے رشتہ منظور کیا گیا، کینیڈا میں ہونے کی بنا پر لڑکا اپنے کاموں کی نوعیت کے لحاظ سے محدود وقت ہی کے لئے پاکستان آسکتا تھا، اس لئے اس کے بارے میں یہ طے تھا کہ وہ نکاح سے ایک دو روز قبل پاکستان آئے گا اور چند ہی روز بعد اہل خانہ کے ساتھ واپس کینیڈا چلا جائے گا، ان حالات کی بنا پر راقم کے والد ماجدؒ نے احتیاطاً یہ شرط عائد کی تھی کہ لڑکے سے ملاقات ہونے پر کوئی بے اطمینانی کی بات سامنے آئی تو عین موقع پر بھی

عذر کیا جاسکتا ہے چونکہ ظاہری اسباب میں بے اطمینانی کی وجہ نہ تھی، اس لئے فریق آخر نے یہ شرط منظور کرلی، اگرچہ مجموعی حالات کے لحاظ سے کسی بھی فریق کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہ تھی کہ یہ رشتہ نہ ہوسکے گا، اس لئے دونوں طرف سے تیاریاں مکمل تھیں............دو دن قبل لڑکا کینیڈا سے آیا، حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، حسن صورت' ظاہری وجاہت، طرز تکلم اور آداب معاشرت کے لحاظ سے ہمارے تصور سے بہتر نکلا، دل کو اطمینان ہوا، لیکن اس سے بات چیت کے بعد پردہ کے بارے میں آزاد خیالی محسوس ہوئی جس سے فکر ہوئی، دینی تصلب کی بنا پر اس سلسلے میں حضرت والد صاحبؒ کی تشویش دوچند تھی، بعض اعزہ نے اطمینان دلایا کہ خاندان سے جڑنے کے بعد یہ کمی بھی دور ہوجائے گی اس لئے اتنے اچھے رشتے کو رد کرنا مناسب نہیں لیکن دینی معاملات میں حساس ہونے کی بنا پر حضرت والد صاحبؒ کی تشویش رفع نہ ہوئی، فرمانے لگے کہ کنیڈا کے ماحول میں اس آزاد خیالی کے کم ہونے کے مقابلے میں بڑھنے کا اندیشہ زیادہ ہے، بالآخر اپنی حمیت دینی کی بنا پر نکاح سے ایک دن قبل حضرت والد صاحب نے یہ رشتہ رد فرمادیا، اس تقریب نکاح کی تمام تیاریاں مکمل تھیں، شادی کارڈ تقسیم کئے جاچکے تھے، فریقین کی تقریبات کے لئے ہال بک تھے، طعام وغیرہ کے انتظامات مکمل ہوچکے تھے، اس فیصلے کی بنا پر ہر طرح کی قربانی دینی پڑی لیکن حضرت والد صاحبؒ کی غیرت ایمانی نے سب کو برداشت کیا۔ شاید اسی کی برکت تھی کہ انہی ہمشیرہ کا بعد میں مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دہلوی خاندان کے ایک حافظ وعالم کا رشتہ آیا جو منظور کیا گیا۔"

(متاع نور، ص:۳۱۵)

رشتوں کے متعلق یہی شریعت کا معیار ہے کہ دین اور تقویٰ کو پیش نظر رکھا جائے، حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں ایک شخص نے آکر کہا "میری ایک بیٹی ہے، مجھے اس سے بہت محبت ہے، مختلف لوگوں نے پیغام نکاح بھیجا ہے، آپ بتائیں میں اس کے لیے کیسے آدمی کا انتخاب کروں؟" حضرت بصریؒ نے فرمایا "اس کی شادی ایسے آدمی سے کرایئے جو اللہ سے ڈرتا ہو، متقی ہو، کیونکہ اس طرح کے آدمی کو اگر آپ کی بیٹی سے محبت ہوگی تو اس کی عزت کرے گا، نفرت ہوگی تو اس پر ظلم نہیں کرے گا"

(إرشاد الساری شرح بخاری، ج:۱۱،ص:۳٦٥)

فضول گوئی

ایک شخص حضرت امیر معاویہؓ کی مجلس میں فضول گوئی میں مصروف تھا جب کافی دیر گذر گئی تو کہنے لگا "اے امیر المومنین! کیا میں خاموش ہو جاؤں"؟ حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا "کیا تم نے کوئی "بات" بھی کی ہے"؟

(عیون الاخبار جلد:۲، ص:۱۷۴)

تقریر اور تکرار

ابن سماک تقریر کر رہا تھا، اسکی باندی گھر بیٹھی سن رہی تھی، وہ تقریر سے فارغ ہو کر گھر آیا اور باندی سے پوچھا "میری تقریر کیسی رہی؟" اس نے جواب دیا، "تقریر تو بہت اچھی تھی مگر ایک بات کو بار بار دوہرانا پسند نہیں آیا" ابن سماک نے کہا "میں بار بار اس لئے دہرا رہا تھا تاکہ جو نہیں سمجھا وہ سمجھ جائے" باندی نے کہا، "جب تک نہ سمجھنے والوں کو آپ سمجھاتے رہے اس وقت تک سمجھنے والے اکتاتے رہے"۔

(...... ص:۱۷۸)

☆☆☆☆

جس کے لیے......

عرب کے مشہور عاشق شاعر "کثیر" سے کسی نے پوچھا، "آپ نے شعر کہنا کیوں چھوڑ دیا؟" اس نے جواب دیا، "میری محبوبہ "عزہ" مر گئی ہے لہذا تازگی و نشاط باقی نہیں رہا، جوانی ساتھ چھوڑ گئی ہے اس لئے لطف نہیں آتا اور ابن لیلیٰ (عبدالعزیز بن مروان) دنیا سے چلا گیا ہے اس لئے دل نہیں چاہتا، ان تینوں سے میری شاعری کی دنیا آباد تھی، وہ نہ رہے تو شاعری کس کے لئے؟ (......ص:۱۸۵)

حکیمانہ دعا

ایک اعرابی ملتزم کے پاس کھڑا یوں دعا کر رہا تھا "اے اللہ! آپ کے جو حقوق مجھ پر ہیں وہ مجھے بخش دیجئے اور لوگوں کی جو ادائیگیاں مجھ پر لازم ہیں، انہیں اپنے ذمہ لے لیجئے، آپ ہر مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور میں بھی مہمان ہوں لہذا آج کی رات جنت سے میری مہمان نوازی کیجئے"۔ (......ص:۲۸۵)

بصیرت افروز جواب کی تاثیر

تار تاری قوم جس نے عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور جس نے لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا، شیخ جمال الدین نامی ایک بزرگ کا حکیمانہ جملہ اس قوم کے اجتماعی طور سے اسلام قبول کرنے کا سبب بنا، چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

"سلطان کاشغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خان (۱۳۴۷ـ۱۳۶۳) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کاشغر آئے اور انہوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی ہم سفر تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین

پر ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکیں کسوا کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم کیوں ہماری زمین پر بغیر اجازت داخل ہوئے؟ شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں، اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت ہے، بادشاہ کو جب علم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں، تو اس نے کہا ایرانی سے کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا توفی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے، یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا، اور حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے، اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب ہے؟، یہ سن کر شیخ نے اسلام کے احکامات اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تغلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا، اب موم کی طرح نرم پڑ گیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لا سکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے ملک اور تخت کا مالک بنوں تو تم اس وقت میرے پاس آنا، چغتائیہ سلطنت چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اور برسوں کے بعد تغلق تیمور اس قابل ہوا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلمرو چغتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کر دے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا

وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا " تغلق تیمور ایک دن بڑا بادشاہ ہوگا، تم اس وقت اس کے پاس جانا اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلانا کہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا" چند سال کے بعد تغلق تیمور نے باپ کا تخت حاصل کر لیا، تو ایک دن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضوری نہ ہوئی، آخر کار مجبور ہو کر اس نے یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تغلق کے خیمہ کے قریب اذان شروع کی، تغلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام اس کو سنایا، تغلق کو پہلے ہی اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اس زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا، جو چغتائی بن چنگیز خان کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔

(تاریخ دعوت وعزیمت جلد:۱، ص:۹۵)

......طاؤس ورباب آخر

خلافت عباسیہ، خلافت امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیاداری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور برے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کارفرما تھی، اس کی خرابیاں اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی، وہ عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو

گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:
امطری حیث شئت فسیاتینی خراجك "جہاں تیرے جی میں آئے جا کر برس جا، تیری پیداوار کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا"

دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و عیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:

"مامون مع خاندان شاہی و ارکان دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام حسن بن سہل (وزیر اعظم جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا مہمان ہوا، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات کی ایسی فیاضانہ حوصلہ سے مہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی بسر کر لی، خاندان ہاشم وافسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر مشک و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار کی گئیں، جن پر کاغذ لپٹے ہوئے تھے اور ہر کاغذ پر نقد، غلام، لونڈی، املاک، خلعت اسپ حاضر، جاگیر وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا، کہ جس کے حصّہ میں جو گولی آئے اس میں جو کچھ لکھا ہو، اسی وقت وکیل المخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر مشک و عنبر کی گولیاں اور درھم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرش بچھایا گیا جو سونے کی تاروں سے بنایا گیا تھا، اور گوہر یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی، اس کے قدم پر نثار کئے گئے، جو زرّین فرش پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے۔"

(المامون از مولانا شبلی نعمانی ص ۱۰۷)

☆☆☆☆

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ اپنے ایک سفر کی سرگذشت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کوئٹہ کے سفر میں احقر علامہ بنوریؒ کے ہمراہ تھا، یہاں مولانا کو کل چوبیس گھنٹے ٹھہرنا تھا۔ جس میں تین مجلسوں سے خطاب کرنا تھا، ایک پریس کانفرنس تھی، گورنر بلوچستان سے ملاقات تھی اور عشاء کے بعد جامع مسجد میں ایک عظیم الشان جلسہ عام تھا۔ سارا دن مولانا کو ایک لمحہ بھی آرام نہ مل سکا، اور رات کو جب ہم جلسہ سے فارغ ہو کر آئے، تو بارہ بج چکے تھے، خود میں تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا، مولانا تو یقیناً مجھ سے زیادہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس کے بعد میں سو گیا، رات کے آخری حصے میں آنکھ کھلی تو دیکھا کہ مولانا کی چارپائی خالی ہے اور وہ قریب بچھے ہوئے ایک مصلے پر سجدے میں پڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں، اللہ اکبر! ایسے سفر، اتنے تھکان اور مصروفیت میں بھی نالۂ نیم شبی جاری تھا، یہ دیکھ کر مجھے تو ایک ندامت ہوئی کہ مولانا اپنے ضعف، علالت اور سفر کے باوجود بیدار ہیں اور ہم صحت مند اور نوعمری کے باوجود محو خواب! اور دوسری طرف یہ اطمینان بھی ہوا کہ جس تحریک کے قائد کا رشتہ ایسے ہنگامہ دار و گیر میں بھی اپنے رب سے اتنا مستحکم ہو، ان شاء اللہ ناکام نہیں ہو گی۔ اس زمانے میں ملک بھر میں مولانا کا طوطی بول رہا تھا، اخبارات مولانا کی سرگرمیوں سے بھرے ہوئے ہوتے تھے اور ان کی

تقریریں اور بیانات شہ سرخیوں سے شائع ہوتے تھے، چنانچہ جب صبح ہوئی، تو میزبانوں نے اخبارات کا ایک پلندہ لاکر مولانا کے سامنے رکھ دیا، یہ اخبارات مولانا کے سفر کوئٹہ کی خبروں، بیانات، تقریروں اور تصویروں سے بھرے ہوئے تھے، مولانا نے یہ اخبارات اٹھاکران پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر فوراً ہی انہیں ایک طرف رکھ دیا، اس کے بعد جب کمرے میں کوئی نہ رہا تو احقر سے فرمایا:

"آجکل کوئی تحریک دین کے لئے چلائی جائے اس میں سب سے بڑا فتنہ نام ونمود کا فتنہ ہے۔ یہ فتنہ دینی تحریکوں کو تباہ کر ڈالتا ہے، مجھے بار بار یہ ڈر لگتا ہے کہ میں اس فتنے کا شکار نہ ہو جاؤں اور اس طرح یہ تحریک ڈوب نہ جائے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس فتنے سے ہم سب کی حفاظت فرمائے ورنہ ہمارے اعمال کو تو بے وزن بنا ہی دے گا، اس مقدس تحریک کو بھی لے کر بیٹھ جائے گا"

یہ بات فرماتے ہوئے مولانا کے چہرے پر کسی تصنع یا تکلف کے آثار نہ تھے، بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیدا ہونے والی تشویش نمایاں تھی۔

(نقوش رفتگاں ص:)

وہ داستان سنائی کہ دامن بھگودیئے

شیخ الحدیث حضرت مولانا موسیٰ روحانی بازیؒ ہمارے اس دور کے جلیل القدر علماء اور عبقری شخصیات میں سے تھے، ان کے صاحبزادے نے ان کی زندگی کا ایک عجیب واقعہ لکھا، وہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ حضرت شیخ" بمع اہل وعیال حج کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ حج کے بعد چند روز مدینہ منورہ میں قیام فرمایا، مولانا سعید احمد خانؒ (جو کہ تبلیغی جماعت کے بڑے بزرگوں میں سے

تھے) کو جب آپ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو آپ کی بمع اہل خانہ اپنی مدینہ منورہ والی رہائشگاہ پر دعوت کی، دعوت کے دوران والد محترمؒ، مولانا سعید احمد خانؒ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص (جو کہ مدینہ منورہ ہی کا رہائشی تھا) آیا، اس نے جب مولانا محمد موسیٰ روحانی بازیؒ کو اس مجلس میں تشریف فرما دیکھا تو انہیں سلام کر کے مؤدبانہ انداز میں ان کے قریب بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ "حضرت میں آپ سے معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے معاف فرمادیں" والد ماجدؒ نے فرمایا "بھائی کیا ہوا؟ میں تو آپ کو جانتا ہی نہیں، نہ کبھی آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ تو کس بات پر معاف کروں؟" وہ شخص پھر کہنے لگا کہ بس حضرت آپ مجھے معاف کر دیں۔ حضرت شیخؒ نے فرمایا کہ "کوئی وجہ بتلاؤ تو سہی؟" وہ شخص کہنے لگا "جب تک آپ معاف نہیں فرمائیں گے، میں بتلا نہیں سکتا" تو اپنے مخصوص لب ولہجہ میں والد صاحبؒ نے فرمایا "اچھا، بھئی معاف کیا، اب بتلاؤ کیا بات ہے؟" وہ کہنے لگا "حضرت میری رہائش مدینہ منورہ میں ہی ہے، میں اپنے رفقاء اور ساتھیوں سے اکثر آپ کا نام اور آپ کے علم وفضل کے واقعات سنتا رہتا تھا، چنانچہ میرے دل میں آپ کی زیارت وملاقات کا شوق پیدا ہوا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تمنا بڑھتی گئی مگر کبھی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ اتفاق سے چند دن قبل آپ مسجد نبوی میں نوافل میں مشغول تھے کہ میرے ایک ساتھی نے مجھے اشارے سے بتلایا کہ "یہ ہیں مولانا محمد موسیٰ صاحب، جن کے بارے میں تم اکثر پوچھتے رہتے ہو" میں نے چونکہ اس سے پہلے آپ کو دیکھا نہیں تھا، اس لیے میرے ذہن میں آپ کے بارے میں ایک تصور قائم تھا کہ پھٹا پرانا لباس ہوگا، دنیا کا کچھ پتہ نہیں ہوگا لیکن

جب میں نے نوافل پڑھتے ہوئے آپ کا حلیہ اور وجاہت دیکھی تو میرے ذہن میں جو پھٹے پرانے لباس کا تصور تھا، وہ ٹوٹ گیا اور دل میں آپ کے بارے میں کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی چنانچہ میں آپ سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ گیا۔ اسی رات کو خواب میں مجھے نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی، کیا دیکھتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ انتہائی غصے میں ہیں، میں نے عرض کیا "یارسول اللہ ﷺ! مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی کہ آپ ناراض دکھائی دے رہے ہیں؟" نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "تم میرے موسیٰ کے بارے میں بدگمانی کرتے ہو، فوراً میرے مدینے سے نکل جاؤ"۔ میں خوف سے کانپ گیا، فوراً معافی چاہی، فرمایا "جب تک ہمارا موسیٰ معاف نہیں کرے گا میں بھی معاف نہیں کروں گا"۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد میں بیدار ہو گیا اور اس دن سے میں مسلسل آپ کو تلاش کر رہا ہوں مگر آپ کی جائے قیام کا پتہ نہیں لگا سکا۔ آج آپ سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی تو معافی مانگنے کے لیے حاضر ہو گیا ہوں۔ حضرت شیخؒ نے جب یہ واقعہ سنا تو پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے"۔

(ترغیب المسلمین، ص:۳)

بساطِ سخن میں درد کی شمع جلائے رکھنا

مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

"مجھے ایک مرتبہ اچانک اس کا اندازہ اور علم ہوا کہ مولانا کے گھر میں عام طور پر کیسی گزران اور کیا معیار زندگی ہے، رمضان مبارک میں غریب مسلمانوں کے یہاں بھی کچھ نہ کچھ اہتمام اور

تکلف ہوتا ہے، لیکن مولانا کے یہاں میں نے اتنا بھی اہتمام نہیں پایا، واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک رمضان المبارک میں، میں مولانا کی خدمت میں مقیم تھا، مولانا نے ایک روز فرمایا کہ آج کھانا میرے ساتھ کھایئے گا، افطار ہم لوگوں نے پنجاب کے رواج کے مطابق مسجد میں پانی اور چھوہارے سے کیا، نماز مغرب کے بعد مولانا نوافل میں مشغول ہو گئے، فارغ ہوئے تو میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ "مولوی صاحب! میں گھر میں اطلاع دینا بھول گیا کہ آج آپ ساتھ کھانا کھائیں گے" یہ کہہ کر مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ فرمایا، کھانا آیا، صرف روٹی اور دال کا پیالہ تھا غالباً ماش کی تھی، اسی وقت دہی کا میری خاطر اضافہ کیا گیا، مولانا نے کھاتے ہوئے فرمایا کہ مولوی ابوالحسن صاحب! ہم سے تو یہ دال اچھی ہے کہ یہ جس مقصد کے لیے پیدا کی گئی تھی، اس کو اس نے پورا کیا، مگر ہم نے اپنی زندگی کا مقصد پورا نہیں کیا" اس کے بعد بغیر کسی معذرت کے کھانے میں شریک ہو گئے، اور ایسا معلوم ہوا کہ آج کوئی غیر معمولی بات نہ تھی"

(پرانے چراغ، ج:۱، ص:۱۵٦۔)

☆☆☆☆

سکون حرام ہے مرے انہدام کے بعد

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی سلگتی شام جب بابری مسجد کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی، اس وقت منہدم شدہ عمارت کے ملبے، ٹوٹے ہوئے گنبد و محراب کے ذروں اور شکستہ در و دیوار کے ریزوں سے نکلنے والی "دردناک صدا" جو مخاطب ہے فرزندان توحید سے اور جو دراصل مسلمانوں کے نام شہید بابری مسجد کے "آخری پیام" کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کے لباس میں پیش خدمت ہے (نداخیالی)

اٹھو اٹھو دم رخصت سلام لو میرا
پیامِ دعوتِ توحید تھام لو میرا

کہاں ہو ایک خدا کے پکارنے والو!
دلوں میں عظمتِ ایماں اتارنے والو!
عروسِ زیست کی زلفیں سنوارنے والو!
میرے وجود کی بازی کو ہارنے والو!

یہ ریزہ ریزہ سی اینٹیں، پکارتی ہیں تمہیں
مرے لہو کی یہ چھینٹیں پکارتی ہیں تمہیں

نظر نظر میں مری یاد کو بسائے ہوئے
دلوں میں مشعلِ عزم ویقیں جلائے ہوئے
غرور حلقۂ باطل پہ تلملائے ہوئے
ہر اک پیامِ نبوت گلے لگائے ہوئے

رسولِ پاک کی امت کے نونہالو اٹھو
اٹھو اٹھو رہِ اسلام کے جیالو اٹھو

نئے مزاج میں اپنے کو ڈھالنا ہے تمہیں
اٹھو کمند ستاروں پہ ڈالنا ہے تمہیں
سسکتی قوم کو غم سے نکالنا ہے تمہیں
اٹھو کہ نظمِ گلستاں سنبھالنا ہے تمہیں

بصد خلوص یہ میرا پیام لیکے اٹھو
جہاں میں دعوتِ خیر الانام لیکے اٹھو

تمام عالم امکاں کو ساتھ لیکے چلو!
زمیں پہ مشعلِ راہِ نجات لیکے چلو!
نبی کا سوز عمرؓ کی صفات لیکے چلو!
کلامِ پاک کا نظمِ حیات لیکے چلو!

یہ دین ایک امانت ہے سارے عالم کی
تمہیں سپرد امامت ہے سارے عالم کی

مرا لہو، مری عالم میں واپسی کے لیے
پکارتا ہے تمہیں فرض منصبی کے لیے
بہار دینِ محمد کی تازگی کے لیے
اٹھو سفینۂ عالم کی رہبری کے لیے

بلال وحیدر وخالد سی ہستیاں بن کر
مٹاؤ سطوتِ باطل کو آندھیاں بن کر

وفا کے پھول ہر اک گام پر بچھاتے چلو
لہو کے دیپ ہر ایک موڑ پہ جلاتے چلو
تمہارے پاس جو دولت ہے وہ لٹاتے چلو
جہاں میں نغمہ توحید گنگناتے چلو

بھنور میں کشتیٔ ملت ہے ڈگمگائی ہوئی
بڑھو کہ سامنے جنت ہے جگمگائی ہوئی

یہ عشرتیں، یہ تغافل یہ مستیاں کب تک؟
"عروس زر" پہ مٹیں گی جوانیاں کب تک؟
رسوم وجہل کا یہ سیل بیکراں کب تک؟
یہ بات بات پہ آپس میں تلخیاں کب تک؟

یہ آخری ہے میری التجا سلام کے بعد
سکوں حرام ہے اب میرے انہدام کے بعد

☆☆☆☆

سورۃ یٰسین کی برکت

صاحب فوائد الفواد لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ امام ناصرالدین لبستی" بیمار ہوئے اور اس بیماری میں آپ کو مرض سکتہ ہو گیا، اعزاواقرباء نے آپ کو مردہ تصور کر کے دفن کر دیا۔ رات کے وقت آپ کو ہوش آیا، خود کو مدفون دیکھا، سخت متحیر ہوئے، اس حیرت وپریشانی واضطراب میں

آپ کو یاد آیا کہ جو شخص حالت پریشانی میں چالیس مرتبہ سورۂ یٰسین پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اضطراب کو رفع کرتا ہے اور تنگی فراخی سے بدل جاتی ہے۔ چنانچہ آپ نے سورۂ یٰسین پڑھنی شروع کی، ابھی انتالیس مرتبہ پڑھ چکے تھے کہ ایک کفن چور نے کفن چرانے کی نیت سے آپ کی قبر کھودی، امام نے اپنی فراست سے معلوم کیا کہ یہ کفن چور ہے چالیسویں مرتبہ آپ نے بہت دھیمی آواز سے پڑھنا شروع کیا کہ دوسرا شخص نہ سن سکے، ادھر آپ نے چالیسویں مرتبہ پورا کیا ادھر کفن چور بھی اپنا کام پورا کر چکا تھا۔ آپ اٹھ کر قبر سے باہر آئے کفن چور اس قدر ڈرا کہ اس کا دل پھٹ گیا اور چل بسا، امام ناصر الدین کو خیال ہوا کہ اگر میں فوراً شہر چلا جاؤں تو لوگوں کو سخت پریشانی و حیرت و ہیبت ہوگی، پس آپ رات کو ہی شہر میں گئے اور ہر محلّہ کے دروازے کے آگے پکارتے تھے کہ میں ناصر الدین لبستی ہوں تم لوگوں نے مجھے سکتہ کی حالت میں دیکھ کر غلطی سے مردہ تصور کیا اور دفن کر دیا، میں زندہ ہوں، اس واقعہ کے بعد امام ناصر الدین نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی"

(فوائد الفواد مترجم ص:۱۳۹)

اس طرح کا واقعہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور عالم و ادیب علامہ بدیع الزمان کے ساتھ بھی پیش آیا کہ وہ بیمار تھے، بیماری کے عالم میں ان پر سکتہ طاری ہوا، لوگ سمجھے کہ انتقال کر گئے، اس لیے ان کی تکفین و تجہیز کر دی گئی اور انہیں دفن کر دیا، حالانکہ آپ زندہ تھے، قبر میں ہوش آیا تو چیخ پڑے، لوگوں نے قبر دوبارہ کھولی، تو آپ نے داڑھی ہاتھ سے پکڑی رکھی تھی اور قبر کی ہولناکی کی وجہ سے انتقال فرما گئے تھے۔

(وفیات الأعیان، ج:۱، ص:۱۲۸)

نیت کا اثر

جہانگیر بادشاہ اپنی "توزک" میں لکھتا ہے:

"ایک سلطان گرمی کے موسم میں ایک باغ کے دروازہ پر پہنچا، وہاں ایک بوڑھا باغبان کھڑا تھا، اس کو دیکھ کر سلطان نے پوچھا، کیا اس باغ میں انار ہے۔ باغبان نے کہا "ہے" سلطان نے کہا "ایک پیالہ انار کا رس لاؤ" باغبان کی ایک لڑکی صورت کے جمال اور سیرت کے حسن سے آراستہ تھی۔ باغبان نے اس سے انار کا رس لانے کو کہا، وہ گئی اور ایک پیالہ بھر کر انار کا رس لے آئی۔ پیالہ پر انار کی کچھ پتیاں رکھی ہوئی تھیں، سلطان نے اس کے ہاتھ سے پیالہ لیا اور پورا پی گیا، پھر لڑکی سے پوچھا، پیالہ کے رس کے اوپر تم نے پتیاں کس لیے رکھ دی تھیں، لڑکی نے عرض کیا، اس گرمی میں آپ پسینہ میں غرق تھے، رس کا ایک سانس میں پی جانا آپ کے لیے مناسب نہ تھا، میں نے احتیاطاً اس پر پتیاں ڈال دی تھیں کہ آپ آہستہ آہستہ اس کو نوش جان فرمائیں، سلطان کو یہ حسن ادا بہت پسند آئی، اس کے بعد اس باغبان سے پوچھا کہ تم کو ہر سال اس باغ سے کیا حاصل ہوتا ہے، اس نے جواب دیا "تین سو دینار" سلطان نے پوچھا، حکومت کو کیا دیتے ہو؟ باغبان نے کہا، میرا بادشاہ درخت سے کچھ نہیں وصول کرتا ہے، بلکہ کھیتی سے عشر لیتا ہے۔ سلطان کے دل میں یہ خیال گزرا کہ میری مملکت میں بہت سے باغ اور درخت ہیں اگر باغ سے بھی عشر لیا جائے تو کافی رقم جمع ہو سکتی ہے اور رعیت کو بھی زیادہ نقصان

نہیں پہنچے گا، اس لیے میں حکم دوں گا کہ باغات کے محصولات سے بھی خراج لیا جائے، یہ سوچ کر اس نے انار کا رس پھر پینے کو مانگا۔ لڑکی رس لانے گئی تو بہت دیر میں آئی، جب پیالہ لائی تو سلطان نے کہا کہ پہلی بار تم گئیں تو بہت جلد آئیں، اس بار دیر بھی کی اور رس بھی کم لائیں، لڑکی نے کہا "پہلی بار ایک انار میں پیالہ بھر گیا تھا، اس مرتبہ میں نے پانچ چھ انار نچوڑے، پھر بھی رس پورا نہیں ہوا"...... یہ سن کر سلطان کو حیرت ہوئی، باغبان نے عرض کیا "محصول کی برکت بادشاہ کی نیک نیت پر منحصر ہے، میرا خیال ہے کہ آپ بادشاہ ہیں، آپ نے جس وقت باغ کی آمدنی مجھ سے پوچھی، اسی وقت آپ کی نیت میں تبدیلی پیدا ہوئی اور پھل سے برکت چلی گئی"...... یہ سن کر سلطان متاثر ہوا اور دل سے باغ کی آمدنی کا خیال دور کر دیا، اس کے بعد پھر انار کا رس مانگا، لڑکی گئی اور جلد ہی پیالہ بھر کر انار کا رس لے آئی، تب سلطان نے باغبان کی فراست کی داد دی، اپنے دل کی بات بتائی اور اس کی لڑکی کا خواستگار ہوا۔"

(بزم رفتہ کی سچی کہانیاں ج۲، ص:۴۱۹)

☆☆☆☆☆

صبح

اقبال مرحوم نے صبح کے متعلق کہا ہے:

یہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مؤمن کی اذاں سے پیدا

جب لیلیٰ شب زلفیں سمیٹتی ہے، اندھیرے کھسکتے ہیں، خاموشی رختِ سفر باندھتی ہے، ستارے دم توڑتے ہیں، شبنم پھولوں کو وضو کرانے آتی ہے، روشنی کے لمس سے زندگی کے وجود میں سرشاری دوڑتی چلی جاتی ہے، لمحوں کے چہرے پر رینگتی تاریکیاں چھٹنے کو آتی ہیں اور پو پھوٹنے لگتی ہے، تب طیور آشیانے چھوڑتے ہیں، ڈالیوں میں بنے نشیمن خالی ہوتے چلے جاتے ہیں، دہقاں کھیت کے کنارے شانہ ہلاتا ہے، غنچے چٹکتے، گل مہکتے ہیں، صبا بکھرتی، گلستان نکھرتے ہیں، عندلیب چہکنے اور جگنو بن کر ہر ذرۂ بیاباں چمکنے لگتا ہے...... یقیناً کائنات کی بزم میں طلوع سحر کا یہ پر کیف سماں قدرت کے شاہکار مناظر میں سے ہے، جوش ملیح آبادی نے اس حسین منظر کی منظر کشی کی ہے، پیش خدمت ہے ان کی نظم "صبح" جو کلاسیکی ادب میں اپنی مثال آپ ہے۔

نظر جھکائے عروسِ فطرت جبیں سے گیسو ہٹا رہی ہے
سحر کا تارا نکھر چلا ہے، افق پہ سرخی سی چھا رہی ہے
روش روش نغمہ طرب ہے، چمن چمن جشن رنگ و بو ہے
طیور شاخوں پہ ہیں غزل خواں، کلی کلی گنگنا رہی ہے
ستارہ صبح کی رسیلی جھپکتی آنکھوں میں ہیں فسانے
نگار مہتاب کی نشیلی نگاہ جادو جگا رہی ہے

طیور، بزمِ سحر کے مطرب، لچکتی شاخوں پہ گا رہے ہیں
نسیمِ فردوس کی سہیلی گلوں کو جھولا جھلا رہی ہے
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی
نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے
سحر کو مدنظر ہیں کتنی دعائیں اس چشمِ خوں فشاں کی
ہوا بیاباں سے آنے والی لہو میں سرخی بڑھا رہی ہے
فلک پہ اس طرح چھپ رہے ہیں ہلال کے گرد وپیش تارے
کہ جیسے کوئی نویلی دلہن جبیں سے افشاں چھڑا رہی ہے
کھٹک یہ کیوں دل میں ہو چلی پھر چٹکتی کلیو ذرا ٹھہرنا
ہوائے گلشن کی نرم رو میں یہ کس کی آواز آرہی ہے

☆☆☆☆

مشہور شاعر انور مسعود نے بھی طلوع سحر کی داخلی اور خارجی منظر کشی کی ہے ان کے چند شعر بھی ملاحظہ ہوں:

خاکستر پروانہ سر بزم اڑا کر
گزری ہے صبا شمع کے شعلے کو بجھا کر
معمور فضا ہو گئی آواز اذاں سے
پیمانہ سنبھالا نہ گیا پیر مغاں سے
برخاست ستاروں کی ہوئی بزم شبینہ
ابھرا ہے افق پار سے سورج کا سفینہ
دیوانے چلے شہر سے اور دشت کو نکلے
کچھ نسترن اندام بھی گل گشت کو نکلے

☆☆☆☆

آسان حل

کتاب ''راز حیات'' کے مصنف لکھتے ہیں:

ایک حکیم صاحب تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ اس کے پاس ایک ڈبہ تھا۔ اس نے ڈبہ کھول کر ایک زیور نکالا۔ اس نے کہا کہ یہ خالص سونے کا زیور ہے، اس کی قیمت دس ہزار روپے سے کم نہیں، اس وقت مجھے مجبوری ہے۔ آپ اس کو رکھ کر پانچ ہزار روپے مجھے دید یجئے۔ میں ایک ماہ میں روپیہ دے کر اسے واپس لے لوں گا۔ حکیم صاحب نے کہا کہ نہیں۔ میں اس قسم کا کام نہیں کرتا۔ مگر آدمی نے کچھ اس انداز سے اپنی مجبوری بیان کی کہ حکیم صاحب کو ترس آگیا اور انھوں نے پانچ ہزار روپیہ دے کر زیور لے لیا۔ اس کے بعد انھوں نے زیور کو لوہے کی الماری میں بند کر کے رکھ دیا۔ مہینوں گزر گئے اور آدمی واپس نہیں آیا۔ حکیم صاحب کو تشویش ہوئی۔ آخر انھوں نے ایک روز اس زیور کو لوہے کی الماری سے نکالا اور اس کو بیچنے کے لیے بازار بھیجا، مگر سنار نے جانچ کر بتایا کہ وہ پیتل کا ہے، حکیم صاحب کو سخت صدمہ ہوا، تاہم روپیہ کھونے کے بعد وہ اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے اس کو بھلا دیا، انھوں نے صرف یہ کیا کہ جس زیور کو وہ اس سے پہلے بند الماری میں رکھے ہوئے تھے، اس کو ایک کھلی الماری میں ڈال دیا، انھوں نے اس کو سونے کے خانہ سے نکال کر پیتل کے خانہ میں رکھ دیا۔

انسانی معاملات کے لیے بھی یہی طریقہ بہترین طریقہ ہے۔ انسانوں کے درمیان اکثر شکایت اور تلخی صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ایک آدمی سے ہم نے جو امید قائم کر رکھی تھی اس میں وہ پورا نہیں اترا، ہم نے ایک آدمی کو با اصول سمجھا تھا مگر تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بے اصول ہے، ہم نے ایک شخص کو اپنا خیر خواہ سمجھا تھا مگر وہ بد خواہ ثابت ہوا، ہم نے ایک شخص کو معقول سمجھ رکھا تھا مگر تجربہ کے بعد وہ غیر معقول نکلا۔

ایسے مواقع پر بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اُس خانہ سے نکال کر، اِس خانہ میں

رکھ دیا جائے، جس چیز کو ہم نے سونے کی الماری میں محفوظ کر رکھا تھا، اس کو اس سے نکال کر پیتل کی الماری میں ڈال دیا جائے۔

نگاہِ شوق اگر ہے شریک بینائی

استاد یوسف دہلوی (م ۱۹۷۷) مشہور خوشنویس تھے۔ ان کو فن خطاطی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، کہا جاتا ہے کہ ایک بار جلی خط کا مقابلہ ہوا، جمنا کے کنارے ریت کے میدان میں بہت سے خطاط جمع ہوئے۔ استاد یوسف آئے تو ان کے ہاتھ میں بانس کا ایک بڑا ٹکڑا تھا، انھوں نے بانس سے ریت کے اوپر لکھنا شروع کیا، الف سے ش تک پہنچے تھے کہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ ہو گیا، لوگوں نے کہا کہ بس کیجیے، استاد یوسف نے کہا "میں نے جو لکھا ہے اس میں رنگ بھر دو اور پھر ہوائی جہاز سے چھوٹے سائز میں اس کا فوٹو لے لو، مجھے یقین ہے کہ فوٹو میں وہی خط رہے گا جو میرا اصل خط ہے"......اس کے بعد کسی اور کو اپنا فن پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

استاد یوسف سے ایک شخص نے پوچھا کہ خوش نویسی کا فن آپ نے کس استاد سے سیکھا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی سے نہیں۔ ان کے والد خود ایک مشہور خوش نویس تھے۔ مگر انھوں نے اپنے والد کی شاگردی بھی نہیں کی۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ میں نے خوش نویسی کا فن لال قلعہ سے سیکھا ہے۔ لال قلعہ میں مغل دور کے استادوں کی وصلیاں (تختیاں) رکھی ہوئی ہیں۔ ان تختیوں میں قطعات لکھے ہوئے ہیں جو فن خطاطی کے شاہکار نمونے ہیں۔ استاد یوسف دس سال تک برابر یہ کرتے رہے کہ لال قلعہ جا کر ان تختیوں کو دیکھتے، ہر روز ایک قطعہ اپنے ذہن میں بٹھا کر واپس آتے۔ اس کو اپنے قلم سے بار بار لکھتے۔ اور پھر اگلے دن اپنا لکھا ہوا کاغذ لے کر لال قلعہ جاتے۔ وہاں کی محفوظ تختی سے اپنے لکھے ہوئے کو ملاتے اور اس طرح مقابلہ کر کے اپنی غلطیوں کی اصلاح کرتے۔ اس طرح مسلسل دس سال تک ہر روز لال قلعہ کی قطعات کی تختیوں سے وہ خود اپنی اصلاح لیتے رہے اور ان کو دیکھ کر مشق

کرتے رہے یہی دس سالہ جد وجہد تھی جس نے انھیں استاد یوسف بنادیا۔

اگر آدمی کے اندر شوق ہو تو نہ پیسہ کی ضرورت ہے اور نہ استاد کی، نہ کسی اور چیز کی، اس کا شوق ہی اس کے لیے ہر چیز کا بدل بن جائے گا، وہ بغیر کسی چیز کے ہر چیز حاصل کر لے گا، اقبال نے خوب کہا ہے ۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے یہ کاروبار جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
تیرا وجود ہے قلب ونظر کی رسوائی

☆☆☆☆

نقلِ صحیح

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

"عالمگیرؒ جب تخت نشین ہوئے اور لوگوں میں انعام تقسیم ہونے لگا، ایک بہروپیہ بھی آیا۔ عالمگیر نے پہچان لیا، فرمایا کہ جب دھوکہ دوگے تب انعام ملے گا۔ وہ چلا گیا، مختلف وقتوں میں مختلف روپ بدل کر آیا، مگر عالمگیرؒ دھوکے میں نہ آئے، اس کو معلوم ہوا کہ فلاں مہم پر بادشاہ جانے والے ہیں، کچھ مدت قبل سے رستہ کی منزل پر پہنچ گیا، درویشانہ لباس اور صورت بنا کر بیٹھ گیا، شہر میں شہرت ہو گئی کہ بہت بڑے درویش آئے ہوئے ہیں، لوگوں کا اژدہام رہتا تھا، عالمگیرؒ جب اس منزل پر پہنچے، حسب معمول وزیر سے دریافت کیا کہ "یہاں کوئی درویش یا عالم ایسے ہیں جن سے ملاقات کی جائے"

وزیر نے عرض کیا کہ حضور ایک بہت بڑے درویش یہاں مقیم ہیں۔ فرمایا ہم ضرور ان سے ملاقات کریں گے۔ چنانچہ بغرض ہدیہ کچھ اشرفیاں لے کر وہاں پہنچے، ملاقات ہوئی، بعض تصوف کے مسائل عالمگیرؒ نے دریافت کیے جن کا جواب نہایت تسلی بخش دیا، یہ لوگ اپنے فن کی تکمیل کے لیے سب چیزیں سیکھا کرتے تھے، اس کے بعد عالمگیرؒ نے وزیر کی طرف اشارہ کیا۔ وزیر نے ہدیہ پیش کیا، اس نے لینے سے انکار کیا۔ عالمگیرؒ کو زیادہ عقیدت ہو گئی، سمجھا کہ یہ واقعی درویش کامل ہے، عالمگیرؒ واپس ہوئے تو پیچھے پیچھے یہ بھی ذرا فاصلہ سے ہو لیا۔ جب عالمگیرؒ دربار میں بیٹھے تو اس نے بھی پیش ہو کر جھک کر سلام کیا۔ عالمگیرؒ نے غور سے دیکھا تو پہچان لیا، اس کے کمال فن کا اقرار کیا اور انعام دیا، مگر معمولی جیسا ان لوگوں کو ملا کرتا ہے۔ اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا پھر اس سے پوچھا کہ ہم اس وقت جو دے رہے تھے اب اتنا تھوڑا ہی دے سکتے ہیں، مگر اس وقت کیوں نہیں لیا؟ عرض کیا کہ "حضور! آپ نے جو بھی عطا فرمایا ہے وہی میرے لیے سب کچھ ہے، باقی اس وقت لینے سے میرے کمال میں یعنی فن نقالی میں کھنڈت پڑتی وہ نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ نقل صحیح وہ ہوتی ہے جو اصل کی مطابق ہو اور یہ بات درویشوں کے خلاف ہے کہ وہ دنیا کو حاصل کریں جبکہ میں نے ان کی صورت بنائی تھی، اگر لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی"۔ عالمگیرؒ کو اس کی اس بات کی بڑی ہی قدر ہوئی اور مکرر انعام دیا"

(الافاضات الیومیہ ج ۲ :ص ۳۰۷)

ایک واقعہ......دو سبق

حضرت شفیق بلخیؒ اور حضرت ابراہیم ادہمؒ دونوں ہم زمانہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار شفیق بلخی اپنے دوست ابراہیم ادہم کے پاس آئے اور کہا کہ میں ایک تجارتی سفر پر جا رہا ہوں، سوچا کہ جانے سے پہلے آپ سے ملاقات کرلوں، کیونکہ اندازہ ہے کہ سفر میں کئی مہینے لگ جائیں گے۔

اس ملاقات کے چند دن بعد حضرت ابراہیم ادہم نے دیکھا کہ شفیق بلخیؒ دوبارہ مسجد میں موجود ہیں، پوچھا، آپ سفر پر نہیں گئے؟ کہا "گیا تھا لیکن راستہ میں ایک واقعہ دیکھ کر واپس ہوا، ایک غیر آباد جگہ پہنچا ہی تھا میں نے پڑاو ڈالا، وہاں میں نے ایک چڑیا دیکھی جو اڑنے کی طاقت سے محروم تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر ترس آیا، میں نے سوچا کہ اس ویران جگہ پر یہ چڑیا اپنی خوراک کیسے پاتی ہوگی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ اتنے میں ایک اور چڑیا آئی، اس نے اپنی چونچ میں کوئی چیز دبا رکھی تھی۔ وہ معذور چڑیا کے پاس اتری تو اس کی چونچ کی چیز اس کے سامنے گر گئی۔ معذور چڑیا نے اس کو اٹھا کر کھا لیا، اس کے بعد آنے والی طاقت ور چڑیا اڑ گئی، یہ منظر دیکھ کر میں نے کہا......"سبحان اللہ! خدا جب ایک چڑیا کا رزق اس طرح اس کے پاس پہونچا سکتا ہے تو مجھ کو رزق کے لیے شہر در شہر پھرنے کی کیا ضرورت ہے، چنانچہ میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس چلا آیا"...... یہ سن کر حضرت ابراہیم ادہم نے کہا کہ "شفیق! تم نے اپاہج پرندے کی طرح بننا کیوں پسند کیا، تم نے یہ کیوں نہیں چاہا کہ تمہاری مثال اس پرندے کی سی ہو جو اپنی قوت بازو سے خود بھی کھاتا ہے اور اپنے دوسرے ہم جنسوں کو بھی کھلاتا ہے"...... شفیق بلخی نے یہ سنا تو ابراہیم ادہم کا ہاتھ چوم لیا اور کہا کہ "ابو اسحاق، تم نے میری آنکھ کا پردہ ہٹا دیا، وہی بات صحیح ہے جو تم نے کہی"۔

ایک ہی واقعہ ہے، اس سے ایک شخص نے بے ہمتی کا سبق لیا اور دوسرے شخص نے ہمت کا۔ اسی طرح ہر واقعہ میں بیک وقت دو پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ آدمی کا اپنا امتحان

ہے کہ وہ کس واقعہ کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ایک زاویہ سے دیکھنے میں ایک چیز بری نظر آتی ہے۔ دوسرے زاویہ سے دیکھنے میں وہی چیز اچھی بن جاتی ہے۔ ایک رخ سے دیکھنے میں ایک واقعہ میں منفی سبق ہوتا ہے اور دوسرے رخ سے دیکھنے میں مثبت سبق۔

(رازحیات ص:۱۸۰)

بڑا انسان بڑا بچہ نہیں ہوتا

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن (۱۸۷۹۔۱۹۵۵) نے ۲۰ ویں صدی کی سائنس میں عظیم انقلاب برپا کیا۔ مگر اس کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کر سکا۔ بظاہر وہ ایک معمولی باپ کا معمولی بچہ تھا۔ نو سال کی عمر تک وہ بالکل عام بچہ دکھائی دیتا تھا۔ اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں ایک بار وہ اسکول سے خارج کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کے استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نااہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مگر اس کے بعد اس نے محنت شروع کی تو وہ اس بلندی تک پہنچا جو موجودہ زمانہ میں بمشکل کسی دوسرے سائنس داں کو حاصل ہوئی۔ اس کے بعد سے اس کی شہرت بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ ۱۹۳۳ میں اس نے ہٹلر کے جرمنی کو چھوڑ دیا تھا، ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا کہ جو شخص آئن سٹائن کا سر کاٹ کر لائے گا، اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانہ میں یہ رقم بہت زیادہ تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں پر اتنی قائم ہو چکی تھی کہ کوئی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کر سکا

تاریخ میں اس طرح کی بہت مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ بڑا انسان بننے کے لیے بڑا بچہ پیدا ہونا ضروری نہیں، معمولی حیثیت سے آغاز کر کے آدمی بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ جدوجہد کی شرطوں کو پورا کرے، بلکہ وہ لوگ زیادہ خوش قسمت ہیں جن کو مشکل مواقع میں زندگی کا ثبوت دینا پڑے، کیونکہ مشکل حالات عمل کا محرک ہوتے ہیں، وہ آدمی کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کرتے ہیں، نیز زندگی کے بہترین سبق

ہمیشہ مشکل حالات میں ملتے ہیں۔اعلیٰ انسان راحتوں میں نہیں بلکہ مشکلوں میں تیار ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ خدا کی اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں، یہاں کسی کو اپنے عمل کے لیے معمولی آغاز ملے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہیے، معمولی حالات، زندگی کا سب سے مضبوط زینہ ہیں، تاریخ کی اکثر اعلیٰ ترین کامیابیاں معمولی حالات کے اندر ہی سے برآمد ہوئی ہیں۔

تحفۂ حجاز......آبِ زمزم

مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب، شیخ الحدیث مولانا عبدالحق رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات میں لکھتے ہیں:

> ”اکوڑہ خٹک کے ایک حاجی صاحب حج مبارک سے واپس تشریف لائے تو حضرت اقدس کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ماء زمزم کا ذکر چھڑا تو حضرت شیخ الحدیثؒ (مولانا عبدالحق صاحب) نے ارشاد فرمایا”اللہ تعالیٰ نے ماء زمزم میں برکت، شفائیت اور غذائیت رکھی ہے، آج کل ہماری ایمانی قوتیں کمزور ہو چکی ہیں، اس لیے وہ برکتیں بھی ظاہر نہیں ہوتیں، ایک دور ایسا بھی تھا کہ جب مکہ معظمہ میں نہ ہسپتال تھے نہ ڈاکٹر اور نہ طبیب!ایک ڈاکٹر نے کسی دوسرے ملک سے مکہ معظّمہ میں آکر مطب کھول دیا مگر اس کے پاس کوئی ایک مریض بھی علاج کے لیے نہ آیا جب ڈاکٹر کو مایوسی ہوئی اور وجہ دریافت کی تب معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں سحری کے وقت آبِ زمزم کے کنوئیں کا منہ کھولا جاتا تھا اور لوگ اپنے اپنے برتن پانی سے بھر لیتے تھے اور وہی پانی اپنے مریضوں کو پلاتے جس سے مریض شفایاب ہو جایا کرتے تھے۔
>
> ہمارے استاد شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مظفر نگر کا ایک سفید ریش ڈاکٹر

جب مکہ معظمہ میں زمزم کے کنوئیں پر جاتا تو پانی پیتے وقت یہ دعا کیا کرتا تھا کہ "یا اللہ! میری داڑھی کے بال سیاہ کر دے"...... دس پندرہ روز بعد اس کی داڑھی میں سیاہ بال آنا شروع ہو گئے۔ ڈاکٹر جب تک وہاں رہا یہی معمول جاری رکھا، اچانک کسی ضرورت سے واپسی ہوئی، جب گھر لوٹا تو داڑھی میں آدھے بال سیاہ ہو چکے تھے، اس ڈاکٹر صاحب کو میں نے شیخ مدنی کی مجلس میں دیکھا تھا، جب وہ آئے تو حضرت نے ہمیں اس کا تعارف کرایا تھا، یہ تو ہمارے اساتذہ کرام کے دور کی بات ہے، رونا بھی آتا ہے اور افسوس بھی، کہ آج مسلمان، اسلام اور اس کی تعلیمات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، قلوب میں اسلامی احکام کی عظمت باقی نہیں رہی، اس لیے خدا تعالیٰ نے وہ برکات اور نتائج بھی لے لیے ہیں جو اگلوں پر ہوا کرتے تھے"۔

(صحبتے با اہل حق، ص:۷۸)

عقلمند مجذوب

بہلول مجذوب ہارون رشید کے زمانے میں ایک مجذوب صفت بزرگ تھے، ہارون رشید ان کی باتوں سے ظرافت کے مزے لیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی جذب کے عالم میں پتے کی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بہلول مجذوب ہارون رشید کے پاس پہنچے، ہارون رشید نے ایک چھڑی اٹھا کر اسے دی اور مزاحاً کہا کہ "بہلول! یہ چھڑی تمہیں دے رہا ہوں، جو شخص تمہیں اپنے سے زیادہ بے وقوف نظر آئے اسے دے دینا" بہلول مجذوب نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ چھڑی لے کر رکھ لی اور واپس چلے آئے، بات آئی، گئی، ہو گئی، شاید ہارون رشید بھی بھول گئے ہوں گے، عرصہ بعد ہارون رشید کو سخت بیماری لاحق ہو گئی، بچنے کی امید نہ تھی۔ اطباء نے جواب دے دیا، بہلول مجذوب عیادت کے لیے پہنچے اور سلام کے بعد

پوچھا"امیر المؤمنین کیا حال ہے"؟ ہارون رشید نے کہا"بڑا لمبا سفر درپیش ہے" بہلول نے پوچھا، کہاں کا سفر؟ جواب دیا، آخرت کا۔ بہلول نے سادگی سے پوچھا، واپسی کب ہو گی؟ جواب دیا"بہلول! تم بھی عجیب آدمی ہو، بھلا آخرت کے سفر سے کوئی واپس ہوا ہے" بہلول نے تعجب سے کہا، اچھا آپ واپس نہیں آئیں گے، تو آپ نے کتنے حفاظتی دستے آگے روانہ کیے اور ساتھ کون کون جائے گا؟ جواب دیا، آخرت کے سفر میں کوئی ساتھ نہیں جاتا، خالی ہاتھ جا رہا ہوں، بہلول مجذوب بولا، اچھا اتنا لمبا سفر کوئی معین و مددگار نہیں، پھر تو لیجیے......، ہارون رشید کی چھڑی بغل سے نکال کر کہا...... یہ امانت واپس ہے، مجھے آپ کے سوا کوئی انسان اپنے سے زیادہ بے وقوف نہیں مل سکا، آپ جب کبھی چھوٹے سفر پر جاتے تھے تو ہفتوں پہلے اس کی تیاریاں ہوتی تھیں، حفاظتی دستے آگے چلتے تھے، حشم و خدم کے ساتھ لشکر ہمرکاب ہوتے تھے، اتنے لمبے سفر میں جس میں واپسی بھی ناممکن ہے آپ نے تیاری نہیں کی؟ ہارون رشید نے یہ سنا تو رو پڑے اور کہا"بہلول! ہم تجھے دیوانہ سمجھا کرتے تھے، مگر آج پتہ چلا کہ تمہارے برابر کوئی حکیم نہیں"۔

(خزینہ ص:۱۸۶)

بہلول ایک مرتبہ کسی قبر میں پاؤں لٹکائے مٹی سے کھیل رہے تھے، کسی نے پوچھا"بہلول! یہاں کیا کر رہے ہو؟" کہنے لگے"ایسے لوگوں کے پاس ہوں کہ اگر ان کی صحبت میں رہوں تو مجھے تکلیف نہیں دیتے، اور ان سے دور رہوں تو میری غیبت نہیں کرتے" پوچھنے والے شخص نے کہا"مہنگائی بہت بڑھ گئی ہے، اس کی کمی کے لیے دعا کریں" کہنے لگے:

> "خدا کی قسم! مجھے تو کوئی پروا نہیں، چاہے گندم کے ایک دانے کی قیمت ایک دینار ہی کیوں نہ ہو جائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ حق ہے کہ اس کے حکم کے مطابق اس کی عبادت کریں اور اللہ پر ہمارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق ہمیں رزق دے،

جب رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی ہے تو فکر کرنے کی مجھے کیا ضرورت؟"

(فوات الوفیات لمحمد بن شاکر، ج:۱، ص:۲۲۹)

لسان الغیب

حافظ شیرازیؒ عموماً لسان الغیب سے یاد کیے جاتے ہیں۔اس لقب کے بارے میں مولانا عبدالرحمان جامیؒ فرماتے ہیں کہ ان کو "لسان الغیب" اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ ان کے کلام میں تکلف و تصنع بالکل نہیں اور یہ آمد سوائے تائید غیبی اور القاء کے ممکن نہیں جبکہ مولانا آزاد بلگرامی کا خیال ہے کہ حافظ کو "لسان الغیب" کا لقب اس واسطے دیا گیا ہے کہ اکثر خوش اعتقاد لوگ اس سے فالیں نکالتے ہیں، اور وہ اکثر صحیح نکلتی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں بہت دلچسپ واقعات مشہور ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مہر گم ہو گئی چونکہ وہ بہت قیمتی تھی اور ہیرے جواہرات اس میں لگے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اگر یہ کسی شخص کے ہاتھ لگی اور اس کو غلط طریقے سے استعمال کیا گیا تو حکومت کو بہت بڑا نقصان ہوگا۔ چونکہ عالمگیر کو خواجہ شیرازی سے کمال عقیدت تھی، اس سے فال نکالنے اور دیکھنے کی غرض سے دیوان حافظ اٹھایا اور کنیز کو پکارا کہ چراغ لے کر آؤ، وہ چراغ لے کر آئی، انھوں نے دیوانِ حافظ کھول کر دیکھا تو یہ شعر نکلا ۔

بفروغِ چہرۂ زلفت ہمہ شب زَند رَہِ دل
چہ دلاور است ، وزدے کہ بکف چراغ دارد

(آپ کی زلفوں کی رونق سے ساری رات دل کے راستے پر ڈاکہ پڑتا رہا وہ چور کس قدر دلیر ہے جو ہاتھ میں چراغ رکھتا ہے)

انھوں نے کنیز کی تلاشی لی اور وہ اس کی کمر سے برآمد ہوئی۔

ہمایوں بادشاہ بھی دیوانِ حافظ سے فال نکالا کرتا تھا۔ ایران سے فوج لے کر جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو دیوان سے فال نکالی، یہ شعر نکلا۔

عزیز مصر بزعم برادران غیور
زقعر چاہ برآمد باوج ماہ رسید

بالآخر کئی لڑائیوں کے بعد ہندوستان پر قابض ہوا۔

(حیات شیخ القرآن از مولانا ابراہیم فانی ص:۵۷)

خاکِ قربت پر گلستانِ صد رنگ کھلتے دیکھا

عبداللہ بن طاہر عہد عباسی میں خراسان کے امیر تھے، ان کے پڑوس میں ایک بوڑھی رہتی تھی، جس کی چار بیٹیاں تھیں، کسی نے اس کو مشورہ دیا کہ آپ اپنا گھر فروخت کردیں کیونکہ آپ بڑی تنگدست ہیں، کچھ ہاتھ کھل جائے گا، کہنے لگی، "گھر فروخت کرنے کو تو جی چاہتا ہے لیکن عبداللہ بن طاہر کا پڑوس فروخت کرنے پر دل آمادہ نہیں" عبداللہ تک یہ خبر پہونچی تو انھوں نے پڑوسی ہونے کا واقعتاً حق ادا کیا، بوڑھی کی چاروں بیٹیوں کے لیے یہ ظاہر کرکے کہ یہ میری بیٹیاں ہیں، رشتے تلاش کیے اور ہر لڑکی کو ایک لاکھ کا جہیز دیا۔

مشہور تابعی حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، اس نے اپنا گھر فروخت کرنا چاہا اور اس کی دو ہزار قیمت لگائی، لوگوں نے کہا "اس کی قیمت تو ایک ہزار ہے" کہنے لگا "تم ٹھیک کہتے ہو، دراصل ایک ہزار گھر کی قیمت ہے اور ایک ہزار عبداللہ بن مبارک کے پڑوس کی قیمت ہے" حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کو جب معلوم ہوا تو اس کو بلا کر ایک ہزار درہم دیئے اور کہا "گھر مت بیچو"۔

سلیمان بن الجہم مشہور تابعی ہیں، حضرت سعید بن العاصؓ کے پڑوس میں رہتے تھے، اپنا گھر انھوں نے ایک لاکھ درہم میں فروخت کیا، پھر خریداروں سے فرمانے لگے "سعید بن العاص کے پڑوس کو کتنے میں خریدوگے" کہنے لگے "کیا پڑوس بھی خریدا جاتا ہے؟" فرمایا میرا گھر واپس کرو اور اپنی قیمت لے لو، بخدا میں ایسے پڑوسی کو نہیں چھوڑ سکتا کہ اگر میں

اس کے پاس جاؤں تو میرا حال دریافت کرے، مجھے دیکھے تو استقبال کرے، نہ ہوں تو میرے گھر کی حفاظت کرے، مانگوں تو ضرورت پوری کرے، نہ مانگوں تو از خود تعاون کرے"۔

حضرت سعیدؓ کو جب یہ اطلاع ملی تو گھر کی قیمت ایک لاکھ درہم ان کے پاس بطورِ ہدیہ ارسال کی۔

(المکارم و المفاخر لأبی بکر الخوارزمی، ص:۲۳)

عفیف عاشق

جمیل بن عبداللہ بن معمر مشہور عاشق گذرے ہیں، تبریزی لکھتے ہیں: "و کان إمام المحبین، و سید العاشقین، لم یکن فی زمنه أرق نسیباً منه بشهادة أهل عصره"۔ یہ "بثینہ" نامی عورت پر عاشق تھے، دونوں کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ "عذراء" سے تھا، جس کا خمیر ہی عشق و محبت پر اٹھایا گیا تھا، "لیلیٰ مجنوں" کی طرح ان کا نام بھی ساتھ لیا جاتا ہے، کہتے ہیں "جمیل بثینہ"......بثینہ سے ملنے کے شوق میں جمیل کے یہ اشعار بڑے مشہور ہیں ۔

وخبرتمانی ان تیما ء منزل
للیلیٰ اذا ما الصیف القی المراسیا
فهذی شهور الصیف عنا قد انقضت
فما للنوی ترمی بلیلی المرامیا
ومازلت یابثن حتی لوأننی
من الشوق استبکی الحمام بکی لیا

ومازادنی الواشون إلااصبابة
ولاكثرة الناهين الاتماديا
لقد خفت ان القى المنية بغتة
وفی النفس حاجات الیك كما هیا

علامہ ابن خلکان نے وفیات الاعیان (جلد اول صفحہ ۳۷۰) میں جمیل کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ عباس بن سہل ساعدی ان کے مرض وفات میں عیادت کے لیے حاضر ہوئے، جمیل نے ان سے کہا:

یا ابن سهل! ماتقول فی رجل لم یشرب الخمرقط،
ولم یزن، ولم یقتل النفس، ولم یسرق، یشهدان لا اله الا اللّٰه؟

یعنی ایسے آدمی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے جس نے نہ کبھی شراب پی ہو، نہ زنا کیا ہو، نہ ہی کسی کو قتل کیا ہو، نہ چوری کی ہو اور وہ کلمہ توحید کی گواہی دیتا ہو۔"

عباس بن سہل نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی صاحب نجات ہے اور میں اس کے لیے جنت کی امید رکھتا ہوں لیکن ایسا آدمی کون ہے!" جمیل نے کہا "میں ہوں" عباس بولے "آپ کے پاکدامن رہ جانے کے متعلق تو مجھے یقین نہیں آتا کیونکہ آپ تو بیس سال سے "بثینہ" کے بارے میں تشبیب وغزل کے اشعار کہہ رہے ہیں" جمیل نے جواب میں کہا:

لانالتنی شفاعة محمد صلی الله علیه وسلم، وانی لفی اول یوم من أيام الآخرة، وآخر یوم من أيام الدنيا، إن كنت وضعت یدی علیها لریبة۔

"آج جبکہ میرا آخرت کی زندگی کا پہلا دن اور دنیوی زندگی کا آخری دن ہے، میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے نبی کریم ﷺ کی

شفاعت نصیب نہ ہو اگر میں نے بثینہ پر گناہ کے خیال سے کبھی ہاتھ رکھا ہو"۔

اس کے کچھ دیر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، بثینہ کو وفات کی خبر ہوئی تو بے ہوش ہو کر گری اور ہوش میں آنے کے بعد یہ دو شعر کہے:

وان سلوی عن جمیل لساعة
من الدهر ماحانت ولاحان حینها

سواء علینا یا جمیل بن معمر
اذا مت باساء الحیاة ولینها

جمیل کی وفات ۹۲ھ میں ہوئی ہے، عباس العقاد نے "جمیل بثینہ" کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جو چھپ چکی ہے۔ ان کے بعد ڈاکٹر امیل بدیع یعقوب نے بھی ان کے اشعار اور ان کے پس منظر پر ایک محقق کتاب بنام "دیوان جمیل بثینہ" ترتیب دی ہے۔

☆☆☆☆

ذوقِ لطیف

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب اپنے بھائی مولانا ذکی کیفی مرحوم کے متعلق فرماتے ہیں:

"انہیں خود کوئی راحت یا خوشی میسر آتی تو والدین اور بہن بھائیوں کو اس میں شریک کرنے کی کوشش کرتے تھے بعض اوقات یہ جذبہ اس حد تک بڑھ جاتا کہ دوسروں کو الجھن ہونے لگتی۔ ایک مرتبہ میں لاہور میں تھا، رات گئے تک انہوں نے گھر بھر کو کشت زعفران بنائے رکھا، سونے کے وقت ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، میں بستر پر لیٹ چکا تھا اور روشنیاں گل ہو چکی تھیں، اچانک انھوں نے اپنے کمرے سے مجھے پکارا، مجھے کچھ تشویش سی ہوئی، اور میں دوڑتا ہوا پہنچا۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنے قریب بستر پر بٹھایا اور بستر کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا، بات صرف اتنی تھی کہ ان کے سرہانے ایک کھڑکی تھی، اور باہر سے ایک درخت کی شاخیں اس کھڑکی کو چھوتی تھیں، چودھویں رات کی چاندنی اس درخت کے پتوں میں چھن چھن کر بستر پر ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ بھائی جان کہنے لگے "دیکھ! کتنا خوبصورت منظر ہے، مجھے یہ منظر بڑا حسین معلوم ہوا، میں نے سوچا کہ تم بھی اس منظر سے لطف اندوز ہو کر سو، بس تمہیں اس لئے بلایا تھا"۔

(نقوش رفتگان ص:۳۴)

کیفی مرحوم بڑے اچھے شاعر بھی تھے، ان کا ذکر آیا تو ان کی یہ غزل بھی پڑھتے چلئے:

سحر ہوئی تو نئی دل کشی کے ساتھ آیا
ترا خیال بڑی روشنی کے ساتھ آیا
متاعِ ذوق طلب لٹ گئی سرِ منزل
یہ داغ وہ ہے جو منزل رسی کے ساتھ آیا
جگر کے داغ تو ہم نے چھپا ہی رکھے تھے
مگر یہ گریہ تمہاری ہنسی کے ساتھ آیا
ہجومِ درد میں ہربار یہ ہوا محسوس
اِک ہاتھ قلب پہ آہستگی کے ساتھ آیا
دیارِ غیر میں اب بے کسی کا شکوہ کیا
کہ میں وطن سے بڑی بے کسی کے ساتھ آیا
کسی کی بزم نے دُنیائے دل بدل ڈالی
خودی کے ساتھ گیا، بے خودی کے ساتھ آیا
ڈھلک رہا تھا رُخِ گل پہ شبنمی آنچل
تری حیا کا تصور اسی کے ساتھ آیا

☆☆☆☆

ادب

امام احمد ابن حنبلؒ کی مجلس میں حضرت ابراہیم بن طہمان کا ذکر آیا، امام احمدؒ بیماری کی وجہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، یکدم سیدھے بیٹھ گئے، فرمانے لگے "صالحین اور نیک لوگوں کے تذکرے کے وقت ٹیک لگا کر بیٹھنا مناسب نہیں"۔

(الأنساب للسمعانی، ج:۱، ص:۲۵۷)

چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

حلوان بن سمرہ بخارا کے قریب ایک بستی کے رہنے والے تھے، بڑے عابد وزاہد تھے، ایک دن اذان دے رہے تھے، بارش ہو رہی تھی، کسی نے ان کے نام اس وقت کے امیر وحکمران کا بند خط لا کر دیا، آپ نے لفافے پر امیر کا نام دیکھا تو اسے پڑھے بغیر کیچڑ میں یہ کہتے ہوئے پھینک دیا کہ "میں کب سے حاکم کے کارندوں میں شامل ہوا ہوں"؟...... اس کی اطلاع جب امیر کے پاس پہنچی تو اس نے کہا الحمدللہ الذی جعل فی رعیتی من لا یقرأ کتابی یعنی "خدا کا شکر ہے کہ میری رعایا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو میرا خط نہیں پڑھتے"

کہاں سے تونے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی
کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

(الأنساب للسمعانی، ج:۱، ص:۲۷۲)

علم کی عزت افزائی

ہشیم بن بشیر اصل میں بخارا کے تھے لیکن بغداد میں آ کر آباد ہو گئے تھے، ان کے والد بشیر باورچی تھے، کھانا پکانا پیشہ تھا، ہشیم کو بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا، انہیں اپنے آبائی پیشہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جبکہ ان کے گھر والوں کو ان کا پڑھنا پسند نہیں تھا، وہ گھر والوں

کے نہ چاہنے کے باوجود مسلسل پڑھتے رہے، بغداد میں قاضی ابو شیبہ کا درس حدیث مشہور تھا، یہ اس میں پابندی سے جانے لگے، پابندی سے پڑھنے والا طالب علم استاذ کی نظروں میں آجاتا ہے، ایک مرتبہ ہشیم بیمار ہوئے اور درس میں نہیں آئے قاضی ابو شیبہ نے ان کا پوچھا، کسی نے کہا، بیمار ہے، فرمایا "چلئے، ہم ان کی عیادت کر آتے ہیں" عیادت کے لئے جانے لگے تو اہل مجلس اور شاگرد بھی ساتھ ہوگئے، سب نے بشیر باورچی کے گھر جاکر ان کے بیٹے ہشیم کی عیادت کی، قاضی کے واپس جانے کے بعد بشیر باورچی ان سے کہنے لگے "بیٹے! میں تمہیں علم حدیث حاصل کرنے سے روکتا تھا لیکن اب نہیں روکوں گا، یہ اس علم ہی کی برکت ہے کہ قاضی آج میرے دروازے پر آیا، ورنہ مجھے اس کی کہاں امید تھی!"

(تاریخ بغداد، ج:۱۴، ص:۵۷)

محروم العقل

مشہور اموی حکمران مروان بن الحکم کے ایک بیٹے کا نام معاویہ تھا، مروان کا یہ بیٹا تھوڑے سے موٹے دماغ کا تھا، ایک مرتبہ دمشق میں ایک جگہ کھڑا اپنے بھائی عبدالملک کا انتظار کر رہا تھا، قریب میں ایک گدھا رہٹ یا چکی گھما رہا تھا، گدھے کے گلے میں گھنٹی تھی، ابن مروان نے گدھے کے مالک سے کہا "آپ نے اس کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟" مالک نے کہا "دراصل کبھی مجھ پر نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں جب گھنٹی کی آواز سنائی نہیں دیتی تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ گدھا کھڑا ہے، چکی نہیں گھما رہا، میں آواز دیتا ہوں تو وہ چلنا شروع کر دیتا ہے"...... ابن مروان نے کہا "اگر گدھا ایک ہی جگہ کھڑا ہو کر صرف اپنا سر دائیں بائیں ہلانے لگے، تب گھنٹی کی آواز تو آئے گی جب کہ وہ چل نہیں رہا ہوگا، اس کا آپ کے پاس کیا حل ہے؟"...... مالک کہنے لگا "یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب گدھے کے سر میں آپ کی عقل ہو جبکہ میرا گدھا اس عقل سے محروم ہے"۔

(البیان والتبیین، ج:۲، ص:۱۳۶)

فانی دنیا کے پجاری

امام ابن الجوزیؒ نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "صید الخاطر" میں بخیل دنیاداروں اور دولت کے پجاریوں کے چند عبرت انگیز واقعات نقل کئے ہیں، یہاں ان میں سے تین واقعات نقل کئے جاتے ہیں:

ایک آدمی نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ میری ساس بیمار ہوئی تو مجھ سے کہنے لگی "میرے لئے خبیص (ایک خاص قسم کا حلوہ) خرید لیجئے" چنانچہ میں نے وہ خرید کر دیدیا، کچھ دیر کے بعد میرا چھوٹا بیٹا میرے پاس آ کر کہنے لگا "نانی جان تو سونا نگل رہی ہے" یہ سن کر جب میں اس کے پاس گیا تو وہ واقعتاً اس حلوہ کے ساتھ سونا چبا کر نگل رہی تھی، میں نے ڈانٹ کر اس کا ہاتھ روکا تو وہ مجھ سے کہنے لگی "مجھے ڈر ہے کہ تم میرے مرنے کے بعد میری بیٹی پر کسی اور لڑکی کو بیاہ لاؤ گے" میں نے کہا "ایسا کوئی ارادہ نہیں" اس نے کہا "تم قسم اٹھاؤ" چنانچہ میں نے اس کے کہنے پر قسم اٹھائی، اس کے بعد اس نے سونے کا جمع کردہ ذخیرہ میرے حوالہ کیا اور پھر انتقال کر گئی، کچھ عرصہ کے بعد میں نے قبر سے اس کا ڈھانچہ نکالا اور پانی چھڑک کر اس کو ہلایا تو اس سے تقریباً اسی دینار نکل آئے جو اس نے مرض الموت میں نگل لئے تھے۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک آدمی مسجد میں جھاڑو لگا کر اس کی مٹی جمع کرتا اور پھر اس مٹی سے اینٹیں بناتا، لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی، تو کہنے لگا "یہ مبارک مٹی ہے، اس لئے میری خواہش ہے کہ میری قبر اسی مٹی کی بنی ہوئی اینٹوں سے بنائی جائی" چنانچہ جب وہ مرا تو اس کی قبر اسی کی بنائی ہوئی اینٹوں سے تیار کی گئی لیکن کچھ اینٹیں بچ گئیں لوگوں نے انہیں ایک گھر کی تعمیر میں استعمال کیا، اتفاقاً بارش ہوئی تو وہ اینٹیں بکھر کر ٹوٹ گئیں اور ان سب میں سے دنانیر نکل آئے، لوگوں نے جا کر اس کی قبر کی تمام اینٹوں کو نکال کر توڑا، تو وہ سب دنانیر سے بھری ہوئی تھیں۔

مجھے میرے بعض جاننے والوں نے یہ واقعہ بھی سنایا کہ ایک شخص کے دو بیٹے اور

ایک بیٹی تھی، اس شخص کے پاس ایک ہزار دینار کی خطیر رقم تھی جو اس نے کہیں دفن کی تھی، ایک مرتبہ وہ سخت بیمار ہوا، تو اپنے ایک لڑکے سے کہنے لگا" بیٹا! تیرا دوسرا بھائی تو بالکل فضول و آوارہ ہے، بہن کی شادی ہو گئی ہے، وہ تو شوہر کے گھر بیاہ گئی ہے، فلاں جگہ ایک ہزار دینار میں نے رکھے ہیں، میں صرف تجھے اس مال کا حقدار سمجھتا ہوں، لہذا میرے مرنے کے بعد تم وہ اپنے لئے نکال لینا"...... بیٹے کو جب معلوم ہوا تو اس نے باپ کے مرنے کا انتظار نہیں کیا اور جا کر وہ ایک ہزار دینار نکال لائے، کچھ دنوں کے بعد وہ شخص ٹھیک ہو گیا، بیٹے سے دینار لوٹانے کے لئے کہا تو اس نے انکار کر دیا، اتفاقاً وہ لڑکا بیمار ہوا، باپ نے بڑے اصرار اور لجاجت کے ساتھ اس سے کہا کہ "بیٹا وہ رقم بتادے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تو بھی دنیا سے چلا جائے اور مال کا بھی کسی کو پتہ نہ ہو جبکہ میں نے اپنے تین بچوں میں سے صرف تجھے اس کا حقدار سمجھ کر بتایا تھا"...... بالآخر بیٹے نے وہ جگہ بتادی، جہاں وہ دینار اس نے دفن کئے تھے، کچھ دنوں کے بعد باپ پھر بیمار ہوا، اب بیٹے نے اصرار شروع کیا لیکن اس بار باپ بتانے کے موڈ میں نہ تھا، یہاں تک کہ وہ مر گیا اور مال کسی گمنام جگہ میں دفن کا دفن ہی رہا۔

(صيد الخاطر، ص: ٣٠٤ـ٣٠٥)

کتابیں ہیں چمن اپنا

ایوب بن شجاع نے اپنا غلام عبداللہ اعرابی کے پاس انہیں بلانے کے لئے بھیجا، غلام نے واپس آ کر کہا "میں نے انہیں اطلاع تو کر دی لیکن وہ کہہ رہے تھے، میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہیں، ان سے فارغ ہو کر آتا ہوں حالانکہ وہ کتابوں کے مطالعے میں مصروف تھے، کتابوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا"...... کچھ دیر کے بعد عبداللہ آئے تو ایوب نے ان سے پوچھا تمہارے پاس تو کوئی نہ تھا، پھر تم نے غلام سے یہ بات کیسے کہہ دی، عبداللہ نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

لنا جلساء مانمل حديثهم
ألباء مامونون غيباً ومشهدا
يفيدوننا من علمهم علم من مضى
وعقلا وتاديبا ورأيا مسددا
بلافتنة تخشى ولا سوء عشرة
ولانتقي منهم لسانا ولايدا
فان قلت: اموات فما أنت بكاذب
وإن قلت: أحياء، فلست مفندا

(۱) ہمارے چند عقلمند ہم نشیں ایسے ہیں جن کی باتوں سے ہم نہیں اکتاتے موجودگی اور عدم موجودگی دونوں صورتوں میں ہم ان کے شر سے محفوظ رہتے ہیں۔

(۲) وہ ہمیں گذرے ہوئے لوگوں کے علم، عقل وادب اور صحت رائے کا فائدہ دیتے ہیں۔

(۳) نہ ان سے کسی فتنے کا اندیشہ ہے اور نہ بری صحبت کا اور نہ ہی ہم ان کی زبان اور ہاتھ (کے شر) سے ڈرتے ہیں۔

(۴) انہیں مردہ کہنے کی صورت میں آپ کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا اور اگر آپ انہیں زندہ کہیں تب بھی آپ کو غلط اور بے عقل نہیں کہا جا سکتا۔

آپ کی امانت محفوظ ہے

حضرت عمرؓ کی خدمت میں ایک شخص آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا، دونوں کے درمیان اس قدر مشابہت تھی کہ حضرت عمرؓ حیران ہو گئے، فرمایا ”میں نے باپ بیٹے میں اس طرح کی مشابہت نہیں دیکھی“ آنے والے شخص نے کہا ”امیر المؤمنین! میرے اس بیٹے کی پیدائش کا بڑا عجیب قصہ ہے، اس کی پیدائش سے پہلے جب میری بیوی امید سے تھی تو

مجھے ایک جہادی معرکہ میں جانا پڑا، بیوی بولی "آپ مجھے اس حالت میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟" میں نے کہا أستودع الله مافی بطنك (آپ کے پیٹ میں جو کچھ ہے، میں اسے اللہ کے پاس امانت رکھ کر جارہا ہوں) یہ کہہ کر میں جہادی مہم میں نکل پڑا، ایک عرصہ کے بعد واپس ہوا تو یہ دردناک خبر ملی کہ میری بیوی انتقال کرچکی ہے اور جنت البقیع میں دفن کی گئی ہے، میں اس کی قبر پر گیا، دعا کی اور آنسوؤں سے دل کا غم ہلکا کیا، رات کو مجھے اس کی قبر سے آگ کی روشنی بلند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی، میں نے رشتے داروں سے معلوم کیا تو انہوں نے کہا "رات کو اس قبر سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں"...... میری بیوی ایک پاکباز اور بڑی نیک خاتون تھی، میں اسی وقت اس کی قبر پر گیا تو وہاں یہ حیرت انگیز منظر دیکھا کہ قبر کھلی ہوئی ہے، میری بیوی اس میں بیٹھی ہے، بچہ اس کے پاس کسمسا رہا ہے اور یہ آواز سنائی دے رہی ہے " اے اپنی امانت کو اللہ کے سپرد کرنے والے!...... اپنی امانت لے لے، اگر تم اس بچے کی ماں کو بھی اللہ کے سپرد کر کے جاتے تو واللہ! آج اسے بھی پاتے"...... میں نے قبر سے بچہ اٹھایا اور قبر اپنی اصلی حالت پر آگئی، امیر المؤمنین! یہ وہی بچہ ہے"۔

(كتاب الدعاء للطبرانی، ج:۲، ص:۱۱۸۳)

عظیم باپ عظیم بیٹا

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے والد غلام تھے، اپنے مالک کے باغ میں کام کرتے تھے، ایک مرتبہ مالک باغ میں آیا اور کہا "میٹھا انار لائیے" مبارک ایک درخت سے انار کا دانہ توڑ کر لائے، مالک نے چکھا تو کھٹا تھا، اس کی تیوری پر بل آئے، کہا "میں میٹھا انار مانگ رہا ہوں، تم کھٹا لائے ہو" مبارک نے جا کر دوسرے درخت سے انار لایا، مالک نے کھا کر دیکھا تو وہ بھی کھٹا تھا، غصہ ہوئے، کہنے لگے "میں نے تم سے میٹھا انار مانگا ہے اور تم جا کر کھٹا لے آئے ہو" مبارک گئے اور ایک تیسرے درخت سے انار لے کر آئے، اتفاقاً وہ بھی کھٹا تھا، مالک کو غصہ بھی آیا اور تعجب بھی ہوا، پوچھا "تمہیں ابھی تک میٹھے کھٹے کی تمیز اور پہچان نہیں"......

مبارک نے جواب میں فرمایا "میٹھے کھٹے کی پہچان کھا کر ہی ہو سکتا ہے اور میں نے اس باغ کے کسی درخت سے کبھی کوئی انار نہیں کھایا"...... مالک نے پوچھا "کیوں؟"...... اس لئے کہ آپ نے باغ سے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے اور آپ کی اجازت کے بغیر میرے لئے کسی انار کا کھانا کیسے جائز ہو سکتا ہے"...... یہ بات مالک کے دل میں گھر کر گئی اور تھی بھی یہ گھر کرنے والی بات! تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ واقعتاً مبارک نے کبھی کسی درخت سے کوئی انار نہیں کھایا، مالک اپنے غلام مبارک کی اس عظیم دیانت داری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کرایا، اسی بیٹی سے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ پیدا ہوئے، حضرت عبداللہ بن مبارک کو اللہ جل شانہ نے علمائے اسلام میں جو مقام عطا فرمایا ہے، وہ محتاج تعارف نہیں۔

(وفیات الأعیان، ج:۳، ص:۳۲)

مردِ دانا پر کلام نازک کا اثر

مرزا بیدل ہندوستان کے بڑے مشہور نعت گو فارسی شاعر گذرے ہیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان کی علمی اور قومی زبان فارسی تھی، ان کے نعتیہ کلام کا چرچا ایران میں بھی پہنچا، کلام پسند آئے تو صاحب کلام کو دیکھنے کا شوق دل میں ابھرتا ہے، ان کے کلام سے متاثر ہو کر ایک شخص ایران سے ہندوستان بیدل صاحب سے ملنے آیا، ملاقات ہوئی، معلوم نہیں ذہن میں اس نے نعتیہ کلام پڑھ کر بیدل کا کیسا خیالی خاکہ بنایا ہوگا، لیکن مرزا بیدل کو جب دیکھا کہ وہ داڑھی منڈاتے ہیں تو حیرت سے پوچھا "آپ داڑھی منڈاتے ہیں؟" بیدل نے کہا "جی ہاں، داڑھی تو منڈواتا ہوں لیکن کسی کا دل نہیں دکھاتا"...... "ارے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھاتا ہے" ایرانی مسافر نے برجستہ کہا، ان کے اس جملے کا بیدل پر اس قدر اثر ہوا کہ انہوں نے آئندہ داڑھی منڈوانا چھوڑ دیا۔

☆☆☆☆

حفاظتِ قرآن

ایک شخص نے یہ جانچنا چاہا کہ کون سا دین صحیح ہے، وہ عمدہ اور خوشخط کاتب بھی تھا، اس کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تورات، انجیل اور قرآن کریم کی انتہائی خوبصورت کتابت کی، تاہم درمیان میں کمی بیشی بھی کردی، پھر تورات کو لے کر علمائے یہود کی خدمت میں پیش کیا، انہوں نے اس کا مطالعہ کیا اور خوبصورت کتابت پر اسے انعام سے نوازا، انجیل کا نسخہ عیسائی پادریوں کے پاس لے کر گیا، انہوں نے اس کی محنت کو سراہتے ہوئے بڑی رقم دے کر اس خوش خط نسخے کو خریدا، اس کے بعد قرآن کریم کا نسخہ علمائے اسلام کی خدمت میں لایا، انہوں نے جب اس میں کمی بیشی دیکھی تو پکڑ کر اس کی ٹھکائی کر دی اور اسے حاکم کے پاس لے کر گئے، حاکم نے "تحریف قرآن" کے جرم میں اس کے قتل کا حکم دیا، تب اس نے اصل حقیقت بتائی اور کہا کہ الحمد للہ میں مسلمان ہوں لیکن میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کون سا دین صحیح اور محفوظ ہے اور میرے اس تجربے سے ثابت ہو گیا کہ دین اسلام ہی ایک محفوظ دین ہے، اللہ کی کتاب میں کوئی بھی تحریف نہیں کر سکتا۔

(صفوة التفاسير للصابونی، ج:۲،ص:۱۱۰۔۱۱۱)

مقصد سے لگن

ہندوستان کے ایک تعلیمی نظام کے مشہور داعی نے جب اپنی کوششوں کا آغاز کیا، تو ایک بڑا طبقہ ان کا مخالف تھا، انہوں نے اپنے پروگرام کے لئے مالی تعاون کے سلسلے میں مختلف بااثر لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا، ایک بڑی ریاست کے نواب صاحب سے بھی انہوں نے ملاقات کی، اپنا پروگرام بتایا، نواب صاحب سے تعاون کی درخواست کی، نواب صاحب ان کے نظام تعلیم کے سخت مخالفین میں سے تھے، سامنے تو انہیں کچھ نہیں کہا،

طرح دے گئے اور یہ وعدہ کر کے ان کو رخصت کیا کہ میں بذریعہ ڈاک جو کچھ ہو سکا، ارسال کر دوں گا، چند دنوں کے بعد ڈاک میں انہیں نواب صاحب کی طرف سے ایک صندوقچی ملی، سمجھے کہ کوئی قیمتی ہدیہ ارسال کیا گیا ہے لیکن جب کھولا تو اس میں پرانے جوتوں کا ایک جوڑا تھا، یہ نواب صاحب کی طرف سے ان پر طنز تھا، لیکن انہوں نے اس طنز کا کوئی اثر نہیں لیا، بلکہ جوتوں کا وہ جوڑا فروخت کیا اور اس رقم کی رسید کاٹ کر نواب صاحب کو بھیج دی، نواب صاحب ان کے مقصد کے ساتھ اس قدر لگن کو دیکھ بہت متاثر ہوئے اور اس وقت کے پچیس ہزار کی خطیر رقم ان کے پروگرام کے لئے دیئے۔

(ذکریات علی الطنطاوی، ج:۵ ص:۲۰۷)

عقیدت

حضرت امام شافعیؒ نے اپنا قاصد امام احمد ابن حنبلؒ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تم عنقریب ایک عظیم مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہو مگر اس سے سلامتی کے ساتھ نکل جاؤ گے یعنی قرآن مجید کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے مسئلہ میں، جس وقت قاصد نے امام احمد ابن حنبلؒ کو خبر دی تو وہ امام شافعیؒ کے قاصد کے آنے پر اس قدر خوش ہوئے کہ اسے اپنا کرتہ دیا، قاصد کرتہ لے کر پہنچا اور ان کو خبر دی انھوں نے دریافت کیا، کیا یہ قمیص امام احمدؒ کے بدن پر تھی، اس کے نیچے کوئی اور کپڑا تو نہیں تھا؟ عرض کیا ”نہیں“ امام شافعیؒ نے اس کو بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا، پھر ایک برتن میں رکھ کر اس پر پانی ڈالا، اسے مل کر نچوڑ لیا اور اس غسالہ کو ایک شیشہ میں اپنے پاس رکھ لیا، جب ان کے ساتھیوں میں سے کوئی بیمار ہو تا تو اس کو اس میں سے تھوڑا سا بھیج دیتے، وہ اسے بدن پر ملتا تو اسی وقت شفایاب ہو جاتا۔

(اولیاء اللہ کے اخلاق ص:۵۸)

ہوس چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

ایک دفعہ لوگوں نے حضرت معروف کرخیؒ کے سامنے اقامت کہی اور ایک درویش کو نماز پڑھانے کے لیے آگے کرنے لگے، اس نے انکار کرتے ہوئے کہا "مجھے خوف ہے کہ میں نماز ہی میں مر جاؤں گا اور لوگوں کی نماز نامکمل رہے گی" لوگوں نے اصرار کیا تو اس نے کہا "میں اس شرط پر نماز پڑھاتا ہوں کہ پھر دوسری نماز نہیں پڑھاؤں گا "......اس پر حضرت معروف کرخیؒ نے اسے کہا "دوست! پیچھے ہٹ جا تو دیوانہ ہے پہلے تو نماز میں مر جانے سے ڈرتا تھا، اس کے بعد تیرے جی میں خیال آیا کہ تو دوسری نماز تک زندہ رہے گا" دوسرے آدمی کو آگے بڑھایا اور اس نے جماعت کرائی، یقیناً ہوس چھپ چھپ کر سینے میں بنا لیتی ہیں تصویریں۔

(اولیاء اللہ کے اخلاق ص:۹۰)

بصیرت......دل کی بینائی

مولانا امین صفدر صاحب رحمہ اللہ نے حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ سے اپنی بیعت کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"ایک دن میں "خدام الدین" میں حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی مجلس ذکر کی تقریر پڑھ رہا تھا، جس میں آپ کا فرمان تھا کہ جسمانی آنکھیں تو اللہ تعالیٰ نے گدھوں اور کتوں کو بھی دی ہیں، آنکھیں تو اصل دل کی ہیں، اگر یہ روشن ہو جائیں تو انسان کو حرام حلال کا امتیاز ہو جاتا ہے، اور اگر وہ قبر کے پاس سے گزرے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ یہ قبر

جنت کا باغ ہے یا دوزخ کا گڑھا، میں یہ پڑھ ہی رہا تھا کہ ایک ماسٹر صاحب جن کا نام رشید احمد تھا؛ وہ ہال کمرے میں داخل ہوئے، ان کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ تھا اور کہتے آرہے تھے کہ کسی نے حرام نوٹ لینا ہے، یہ حرام ہے حرام، میں نے کہا مجھے دے دو، وہ مجھ سے پوچھنے لگے تم کیا کرو گے؟ میں نے حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی مجلس ذکر کی وہ تقریر سنائی اور کہا لاہور چلتے ہیں اور امتحان لیتے ہیں کہ خود حضرت لاہوری رحمہ اللہ کو حلال حرام کی تمیز ہے یا نہیں؟ اس پر چار پانچ ٹیچر اور تیار ہوگئے، ہم سب نے ایک ایک روپیہ اپنے پاس سے لے لیا؛ ایک روپے کے سیب اپنے روپے سے اور ایک کے حرام روپے سے خریدے، اس طرح پانچ پھل ہم نے خرید لئے اور ہر پھل پر کوئی ایک نشانی لگادی کہ یہ سیب حرام روپے کا ہے اور وہ حلال روپے کا ہے؛ یہ کینو حرام روپے کا ہے وہ حلال کا؛ غرضیکہ ہم پھل لے کر لاہور پہنچ گئے اور حضرت لاہوری رحمہ اللہ کی خدمت میں جا پیش کئے؛ حضرت رحمہ اللہ نے پھلوں کی طرف دیکھا، پھر ہماری طرف دیکھا اور فرمایا: ”بھئی یہ کیا لائے ہو؟“ میں نے عرض کیا: حضرت! زیارت کے لئے حاضر ہوئے ہیں؛ یہ کچھ ہدیہ ہے، فرمایا: ہدیہ لائے ہو یا میرا امتحان لینے آئے ہو؟ یہ فرما کر آپ رحمہ اللہ نے ان مختلف پھلوں کو الگ الگ کر دیا اور فرمایا یہ حلال ہیں، یہ حرام ہیں، اب ہم نے بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے سختی سے فرمایا: ”چلے جاو، تم بیعت کے لئے تھوڑا آئے ہو، تم تو امتحان کے لئے آئے تھے؛“ اور ہمیں اٹھا دیا؛ ہم واپس اسٹیشن پر آگئے؛ گاڑی آئی؛ باقی چاروں ساتھی سوار ہوگئے؛ مگر میرا دل سوار ہونے کو نہ چاہا؛ میں ٹکٹ واپس کر کے شاہدرہ اپنے ہم زلف کے ہاں چلا گیا اور اگلے دن فجر کی نماز مسجد شیرا

نوالا میں حضرت کی اقتداء میں ادا کی؛ نماز کے بعد درس کی جگہ پر حضرت رحمہ اللہ نے درس قرآن ارشاد فرمایا، درس کے بعد چند ساتھی بیعت کے لئے بڑھے، میں بھی ساتھ بیٹھ گیا؛ دیکھ کر مسکرا کر فرمایا: اچھا اب بیعت کے لئے آگئے ہو؟ میں نے عرض کیا: حضرت! حاضر ہو گیا ہوں، حضرت رحمہ اللہ نے بیعت فرمایا اور اسم ذات، استغفار اور درود شریف کی تسبیحات کی تعلیم فرمائی،"

(سہ ماہی وفاق، ص : ۱۶)

تخت والوں سے بھی اونچے ہیں ترے خاک نشین

کوثر نیازی مرحوم مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کے مزاج کے متعلق لکھتے ہیں:

"بات ان بزرگوں کے اخباری بیانات سے شروع ہوئی تھی۔ اکثر بیانات تو اسلامی دستور کے موضوع پر ان علماء حضرات کے مشترک ہی ہوا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیان کا طرز تحریر حضرت کاندھلوی کو کچھ زیادہ ہی سیاسی محسوس ہوا تو انھوں نے اپنے قلم سے وہیں ایک جداگانہ بیان قلمبند کر کے میرے حوالے کر دیا۔ اس بیان کی بھی ایک اپنی شان ہوتی تھی۔ شروع میں عربی زبان کے اندر پورا خطبہ مسنونہ، اس کے بعد "اما بعد" لکھ کر آیات قرآنی اور احادیث نبوی ﷺ سے استدلال واستشہاد کرتے ہوئے اصل حرفِ مطلب لکھتے جو صرف اور صرف حکمرانوں کو خوف آخرت دلاتے ہوئے اسلامی آئین کے برکات وفضائل پر مشتمل ہوتا۔ میں عرض کرتا "حضرت یہ تو اخباری بیان نہ ہوا، مضمون ہو گیا اسے کون چھاپے گا، تھوڑا اسے سیاسی رنگ بھی دینا پڑے گا" تو ہمیشہ یہی جواب دیتے "مولوی صاحب! ہم تو سیاست ویاست جانتے نہیں ہم تو صرف

قرآن وحدیث کی بات کریں گے، کوئی چھاپتا ہے چھاپے نہیں چھاپتا ہے تو نہ چھاپے، ہمیں اس سے کیا غرض" اور میں لاجواب ہو کر اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ مولانا کی درویشی کا عالم یہ تھا کہ اخبار نہیں پڑھتے تھے، نہ ہی کوئی اخبار گھر پر آتا، میں جب بھی حاضر ہوتا پوچھتے "مولوی صاحب نئی خبر کیا ہے" میں جستہ جستہ تفصیل عرض کر دیتا۔ ایک دن میں نے عرض کیا "حضرت! اگر اجازت ہو تو میں اخبار بھجوا دیا کروں، آپ تازہ ترین حالات سے باخبر رہیں گے" فرمانے لگے "مولوی صاحب! ہم اخبار کیسے پڑھیں ایک تو اس میں فلمی اشتہار ہوتے ہیں دوسرے تصویریں تیسرے خبریں ہوتی ہیں مگر راوی نامعلوم! خدا جانے! یہ ثقہ ہے بھی کہ نہیں ہمیں تو بس اسی طرح خبریں تم ہی بتا دیا کرو" مجھے یاد ہے ایک زمانہ میں اپنے وقت کے صاحبِ جبروت حاکم امیر محمد خان نواب آف کالاباغ نے جو اس وقت مغربی پاکستان کے گورنر تھے آپ سے ملنے کی خواہش کی جو شخص پیغام لایا تھا اس سے کہا" مولوی صاحب میں تو ان کے پاس جانے کا نہیں کہ حکام کے پاس جانا میرے مسلک کے خلاف ہے وہ یہاں آنا چاہیں تو شوق سے آئیں مگر شرط یہ ہے کہ اپنے کمرہ میں کرسی نہیں رکھنے دوں گا بیٹھیں گے تو وہ بھی میرے ساتھ دری پر بیٹھیں گے"۔ اب اس تفصیل کو جانے دیجئے کہ آگے کیا ہوا؟ مختصر یہ کہ ملاقات ہوئی اور اس پر تعریف نواب کالاباغ کی بھی ہونی چاہئے کہ انھوں نے شرط منظور کی اور ایک بوریا نشین فقیر کی کتابوں سے اٹے ہوئے کمرے میں نیچے بیٹھ کر ان سے بات چیت کی۔ سچ ہے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی بات ہی کچھ اور ہے۔

بادشاہوں سے ترے در کے گدا اچھے ہیں
تخت والوں سے بھی اونچے ہیں ترے خاک نشین

(جنھیں میں نے دیکھا، ص:۸۰)

محبت کا کرشمہ

درس وفا گر بود زمزمہ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائی را

ہجرت کی تیسری صدی قریب الاختتام ہے، بغداد کے تخت خلافت پر المعتضد باللہ عباسی متمکن ہے، معتصم کے زمانہ سے دار الخلافہ کا شاہی اور فوجی مستقر "سامرہ میں منتقل ہو گیا ہے، پھر بھی سرزمین بابل کے اس نئے بابل" میں پندرہ لاکھ انسان بستے ہیں، ایران کے اصطخر، مصر کے رسیس، اور یورپ کے روم کے بعد اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد ہے۔

دنیا کی اس ترقی یافتہ مخلوق جسے "انسان" کہتے ہیں کا کچھ عجیب حال ہے، یہ جتنا کم ہوتا ہے، اتنا ہی نیک اور خوش ہوتا ہے اور جتنا زیادہ بڑھتا ہے، اتنی ہی نیکی اور خوشی اس سے دور ہونے لگتی ہے۔ اس کا کم ہونا خود اس کے لئے اور خدا کی زمین کے لئے برکت ہے، یہ جب چھوٹی چھوٹی بستیوں میں چھپر ڈال کر رہتا ہے تو کیسا نیک، کیسا خوش، اور کس درجہ حلیم ہوتا ہے۔ محبت اور رحمت اس میں اپنا آشیانہ بناتی ہے اور روح کی پاکیزگی کا نور اس کے جھونپڑوں کو روشن کرتا ہے، لیکن جونہی یہ جھونپڑوں سے باہر نکلتا ہے اس کی بڑی بڑی بھیڑیں ایک خاص رقبہ میں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ تو اس کی حالت میں کیسا عجیب انقلاب آجاتا ہے۔ ایک طرف تجارت بازاروں میں آتی ہے، صنعت و حرفت کارخانے کھولتی ہے، دولت سربفلک عمارتیں بناتی ہے۔ حکومت و امارت شان و شکوہ کے سامان آراستہ کرتی ہے لیکن دوسری طرف نیکی رخصت ہو جاتی ہے، محبت اور فیاضی کا سراغ نہیں ملتا اور امن و راحت کی جگہ اب انسانی مصیبتوں اور شقاوتوں کا ایک لازوال دور شروع ہو جاتا ہے، وہی انسان کی بستی جو پہلے نیکی و محبت کی دنیا اور راحت و برکت کی بہشت تھی، اب افلاس و مصیبت کا مقتل

اور جرموں اور بدیوں کی دوزخ بن جاتی ہے، وہی انسان جھونپڑوں کے اندر محبت وفیاضی کی گرمجوشی تھا، اب شہر کے سربفلک محلوں کے اندر بے مہری اور خود غرضی کا پتھر ہوتا ہے، جب وہ اپنے عالیشان مکانوں میں عیش ونعمت کے دستر خوانوں پر بیٹھتا ہے، اس کے کتنے ہی ہم جنس سڑکوں پر بھوکے ایڑیاں رگڑتے ہیں، جب وہ عیش وراحت کے ایوانوں میں جمال وحسن کی محفلیں آراستہ کرتا ہے تو اس کے ہمسایہ یتیموں کے آنسو نہیں تھمتے اور کتنی ہی بیوائیں ہوتی ہیں جن کے بدنصیب سروں پر چادر کا ایک تار بھی نہیں ہوتا، زندگی کی قدرتی یکسانیت کی جگہ اب زندگی کی مصنوعی مگر بے رحم تفاوتیں ہر گوشے میں نمایاں ہو رہی ہیں۔

پھر جب انسانی بے مہری اور خود غرضی کے لازمی نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کمزوری، افلاس اور بے نوائی سے مجبور ہو کر بدبخت انسان جرم کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو اچانک دنیا کی زبانوں کا سب سے بے معنی لفظ وجود میں آجاتا ہے۔ یہ "قانون" اور "انصاف" ہے، اب بڑی بڑی شاندار عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں، اور ان کے دروازے پر لکھا جاتا ہے "انصاف کا گھر" انصاف کے اس مقدس گھر میں کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ وہی انسان جس نے اپنی بے رحمی وتغافل سے مفلسی کو چوری پر اور نیک انسانوں کو بداطوار بن جانے پر مجبور کر دیا تھا، قانون کا پر ہیبت جبہ پہن کر آتا ہے اور فرشتوں کا سا معصوم اور راہبوں کا سا سنجیدہ چہرہ بنا کر حکم دیتا ہے۔ "مجرم کو سزا دی جائے" "کیوں؟"۔ "اس لئے کہ اس نے چوری کی" "اس بدبخت نے چوری کیوں کی؟" "اس لئے کہ وہ انسان ہے اور انسان بھوک برداشت نہیں کر سکتا، اس لئے کہ وہ شوہر ہے اور شوہر اپنی بیوی کو بھوک سے ایڑیاں رگڑتے نہیں دیکھ سکتا، اس لئے کہ وہ باپ ہے اور باپ کی طاقت سے باہر ہے کہ اپنے بچوں کے ان آنسوؤں کا نظارہ کر سکے جو بھوک کی اذیت سے ان کے معصوم چہروں پر بہہ رہے ہیں۔ پھر یہ بدقسمت انسان اگر قید خانہ اور تازیانے کی سزائیں جھیل کر اس قابل نہیں ہو جاتا کہ بغیر غذا کے زندہ رہ سکے۔ تو مقدس انصاف اصلاح اور انسانیت کا آخری قدم اٹھاتا ہے اور کہتا ہے: "اسے سولی کے تختے پر لٹکا دو"۔

یہ گویا انسان کے پاس اس کے ابناء جنس کی مصیبتوں اور شقاوتوں کا آخری علاج ہے۔

یہ ہے انسان کی متمدن اور شہری زندگی کا اخلاق وہ خود ہی انسان کو برائی پر مجبور کرتا ہے اور خود ہی سزا بھی دیتا ہے پھر ظلم اور بے رحمی کے اس تسلسل کو انصاف کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اس انصاف کے نام سے جو دنیا کی سب سے زیادہ مشہور مگر سب سے زیادہ غیر موجود حقیقت ہے۔

چوتھی صدی ہجری کا بغداد دنیا کا سب سے بڑا شہر اور انسانی تمدن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ انسانی آبادی و تمدن کے یہ تمام لازمی نتائج موجود ہوتے، گندگی میں مکھیاں اور دلدل میں مچھر اس تیزی سے پیدا نہیں ہوتے ہیں جس تیزی سے شہروں کی آب وہوا جرم اور مجرموں کو پیدا کرتی ہے۔ بغداد کے قید خانے مجرموں سے بھرے ہوئے تھے مگر پھر بھی اس کی آبادی میں مجرموں کی کمی نہ تھی۔

بغداد میں جس طرح آج کل حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی بزرگی کی شہرت ہے، اسی طرح ابن ساباط کی چوری وعیاری بھی مشہور ہے پہلی شہرت نیکی کی ہے، دوسری بدی کی، دنیا میں بدی نیکی کی طرح اس کی شہرت کا بھی مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ کر نہیں سکتی۔ دس برس سے ابن ساباط مدائن کے قید خانہ میں ہے، اس کے خوفناک حملوں سے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں تاہم اس کی عیاریوں اور بیباکیوں کے افسانے لوگ بھولے نہیں، وہ جب کبھی کسی دلیرانہ چوری کا حال سنتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں۔ "یہ دوسرا ابن ساباط ہے" اس دس برس کے اندر کتنے ہی نئے ابن ساباط پیدا ہوگئے ہیں مگر پرانے ابن ساباط کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ بغداد والوں کی بول چال میں وہ جرائم کا شیطان اور برائیوں کا عفریت تھا۔

ابن ساباط کے خاندانی حالات عوام کو بہت کم معلوم ہیں، جب وہ پہلی مرتبہ "سوق النجارین" میں چوری کرتا ہوا گرفتار ہوا تو کوتوالی میں اس کے حالات کی تفتیش کی ، معلوم ہوا یہ بغداد کا باشندہ نہیں ہے، اس کے ماں باپ "ڈس" سے ایک قافلے کے ساتھ آ رہے تھے، راہ میں بیمار پڑے اور مرگئے، قافلہ والوں کو رحم آیا اور اپنے ساتھ بغداد پہنچادیا۔ یہ

اب سے دو برس بیشتر کی بات ہے، یہ دو برس اس نے کہاں اور کیونکر بسر کیئے؟ اس کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گرفتاری کے وقت اس کی عمر پندرہ برس کی تھی، کوتوالی کے چبوترے پر لٹا کر اسے تازیانے مارے گئے اور چھوڑ دیا گیا۔

اس پہلی سزا نے اس کی طبیعت پر کچھ عجیب طرح اثر ڈالا، وہ اب تک ڈرا سہا کمسن لڑکا تھا، اب اچانک ایک دلیر، بیباک مجرم کی روح اس کے اندر پیدا ہو گئی۔ گویا اس کی تمام شقاوتیں اپنے ظہور کے لئے تازیانے کی ضرب کی منتظر تھیں۔ مجرمانہ اعمال کے تمام بھید اور بدیوں، گناہوں کے تمام مخفی طریقے جو کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں گزرے تھے اب اس طرح اس پر کھل گئے گویا ایک تجربہ کار اور مشاق مجرم کا دماغ اس کے سر میں اتار دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر وہ ایک پکا عیار اور چھٹا ہوا جرائم پیشہ انسان تھا۔

اب چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اس نے چوری کی تھی تو دو دن کی بھوک اسے نان بائی کی دوکان پر لے گئی تھی۔ لیکن اب وہ بھوک سے بے بس ہو کر نہیں بلکہ جرم کے ذوق سے وارفتہ ہو کر چوری کرتا تھا۔ اس لئے اس کی نگاہیں نان بائی کی روٹیوں پر نہیں بلکہ صرافوں کی تھیلیوں اور سوداگروں کے ذخیروں پر پڑتی تھیں۔ دن ہو، رات ہو، بازار کی منڈی ہو، یا امیر کا دیوان خانہ، ہر وقت، ہر جگہ، اس کی کارستانیاں جاری تھیں اس کے اندر ایک فاتح کا جوش تھا، سپہ سالار کا سا عزم تھا، سپاہی کی مردانگی تھی، مدبر کی سی دانشمندی تھی لیکن دنیا نے اس کے لئے یہی پسند کیا کہ وہ بغداد کے بازاروں کا چور ہو۔ اس لئے اس کی فطرت کے تمام جواہر اسی میں نمایاں ہونے لگے۔ افسوس فطرت کس فیاضی سے بخشتی ہے اور انسان کس بے دردی سے برباد کرتا ہے۔ ابن ساباط کے ہاتھ کا کٹنا، کٹنا نہ تھا۔ بلکہ سینکڑوں ہاتھوں کو اس کے شانوں سے جوڑ دینا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے شیطان اور عفریت اس واقعہ کے انتظار میں تھے جونہی اس کا ہاتھ کٹا، انھوں نے اپنے سینکڑوں ہاتھ اس کے حوالے کر دیئے۔ اب اس نے عراق کے تمام چور اور عیار اکٹھے کر کے اپنا اچھا خاصا جتھا بنا لیا اور فوجی سامان کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصے کے اندر اس کے دلیرانہ حملوں نے تمام عراق میں تہلکہ مچا دیا۔

وہ قافلوں پر حملہ کرتا، دیہاتوں میں ڈاکے ڈالتا، محل سراؤں میں نقب لگاتا، سرکاری خزانے لوٹ لیتا اور پھر یہ سب کچھ اس ہوشیاری اور مردانگی سے کرتا کہ اس پر یا اس کے ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ہر موقع پر صاف بچ کر نکل جاتا۔ لوگ جب اس کے مجرمانہ کارنامے سنتے تو وہشت و حیرت سے مبہوت رہ جاتے۔ یہ ڈاکو نہیں ہے۔ جرم کی خبیث روح ہے، وہ انسان کو لوٹ لیتی ہے، مگر انسان اسے چھو نہیں سکتا، یہ بغداد والوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔

مگر ظاہر ہے یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی تھی آخر وقت آگیا کہ ابن ساباط تیسری مرتبہ قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ ایک موقع پر جب اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت نکال دیا تھا اور خود بھاگ نکلنے کی تیاری کر رہا تھا، حکومت کے سپاہی پہنچ گئے اور گرفتار کر لیا، اس مرتبہ وہ ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت سے گرفتار ہوا تھا، اس کی سزا قتل تھی، ابن ساباط نے جب دیکھا کہ جلاد کی تلوار سر پر چمک رہی ہے تو اس کے مجرمانہ خصائل نے اچانک دوسرا رنگ اختیار کیا، وہ تیار ہو گیا کہ قتل کی سزا نہ دی جائے تو وہ اپنے جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ اس نے عدالت سے کہا کہ اگر وہ اسے قتل کی سزا نہ دے تو وہ جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ عدالت نے منظور کر لیا، اس طرح ابن ساباط خود تو قتل سے بچ گیا لیکن اس کے سو سے زیادہ ساتھی اس کی نشان دہی پر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے، سو چوروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے قتل ہونے سے پہلے ابن ساباط پر لعنت نہ بھیجی ہو۔ بدعہدی ایک ایسی برائی ہے جسے برے بھی سب سے بڑی برائی سمجھتے ہیں، ابن ساباط نے اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ وہ جرم سے بھی بڑھ کر برائی کا کوئی ایک درجہ رکھتا ہے۔

بہر حال ابن ساباط مدائن کے قید خانہ میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے، اس کی آخری گرفتاری پر دس برس گزر چکے ہیں۔ دس برس کا زمانہ اس کے لئے کم مدت نہیں ہے کہ ایک مجرم کی سیاہ کاریاں بھلا دی جائیں۔ لیکن ابن ساباط جیسے مجرم کے کارنامے مدتوں تک نہیں بھلائے جاسکتے۔ دس برس گزرنے پر بھی اس کے دلیرانہ جرائم کا تذکرہ بچے بچے کی زبان

پر ہے، لوگوں کو یہ بات بھولے سے بھی یاد نہیں آتی کہ ابن ساباط ہے کہاں اور کس حالت میں؟ کیونکہ یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے بھی نہیں، البتہ وہ اس کے دلیرانہ کارنامے بھولنا نہیں چاہتے کیونکہ اس تذکرہ میں ان کے لئے لطف اور دلچسپی ہے، انہیں ابن ساباط کی نہیں اپنی دلچسپیوں کی فکر ہے، انسان کی بے مہریوں کی طرح اس کی دلچسپیوں کا بھی کیسا عجیب حال ہے، عجیب عجیب اور غیر معمولی باتیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن اس کی پروا نہیں کرتا کہ اس کی دلچسپی کا یہ تماشا کیسی کیسی مصیبتوں اور شقاوتوں کی پیدائش کے بعد ظہور میں آتا ہے اگر ایک چور دلیری کے ساتھ چوری کرتا ہے تو یہ اس کے لئے بڑی ہی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے، وہ گھنٹوں اس پر رائے زنی کرتا ہے اور وہ تمام اخبار خرید لیتا ہے جن میں اس کی تصویر چھپی ہوتی ہے یا اس کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس واقعہ میں چور کے لئے کیسی شقاوت ہے؟ اور جس مسکین کا مال چوری کیا گیا، اس کے لئے کیسی مصیبت ہے؟ اس کے سوچنے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

اگر ایک مکان میں آگ لگ جائے تو انسان کے لئے بڑا ہی دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ سارا شہر امنڈ آتا ہے، جس کو دیکھئے، بے تحاشا دوڑا جاتا ہے، لوگ اس نظارہ کے شوق میں اپنا کھانا پینا تک چھوڑ دیتے ہیں، اگر انسانوں کے چند جھلسے ہوئے چہرے آگ کے شعلوں کے اندر نمودار ہو جائیں اور ان کی چیخیں اتنی بلند ہوں کہ دیکھنے والوں کے کانوں تک پہنچ سکیں تو پھر اس نظارہ کی دلچسپی انتہائی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ تماشائی جوش نظارہ میں مجنوں ہو کر ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں لیکن انسانی دلچسپی کے اس جہنمی منظر میں اس مکان اور اس کے مکینوں کے لئے کیسی ہلاکت اور تباہی ہے؟ اور جان و مال کی کیسی المناک بربادیوں کے بعد آگ اور موت کی یہ ہولناک دلچسپی وجود میں آسکی ہے؟ اس بات کے سوچنے کی نہ لوگوں کو فرصت ملتی ہے اور نہ وہ سوچنا چاہتے ہیں!

اگر انسان کی ابنائے جنس میں سے ایک بدبخت مخلوق کو سولی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے تو یہ ان تمام نظاروں میں سے جن کے دیکھنے کا انسان شائق ہو سکتا ہے، سب سے زیادہ دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ اتنا دلچسپ نظارہ کہ گھنٹوں کھڑے رہ کر لٹکتی ہوئی نعش دیکھتا ہے مگر

اس کی سیری نہیں ہوتی، لوگ درختوں پر چڑھ جاتے ہیں، ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں، صفیں چیر چیر کر نکل جانا چاہتے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اپنے ابنائے جنس کی جانکنی میں تڑپنے اور پھر ہوا میں معلق دیکھ لینے کی لذت حاصل کر لیں، لیکن جس انسان کے پھانسی پانے سے انسانی نظارہ کا یہ سب سے دلکش تماشا وجود میں آیا، خود اس پر کیا گزری؟ اور کیوں وہ اس منحوس اور شرمناک موت کا مستحق ٹھہرا، سینکڑوں ہزاروں تماشائیوں میں سے ایک کا ذہن بھی اس غیر ضروری اور غیر دلچسپ پہلو کی طرف نہیں جاتا۔

گرمیوں کا موسم ہے، آدھی رات گزر چکی ہے، مہینہ کی آخری راتیں ہیں، بغداد کے آسمان پر ستاروں کی مجلس شبینہ آراستہ ہے مگر چاند کے برآمد ہونے میں ابھی دیر ہے لیکن دجلہ کے پار کرخ کی تمام آبادی نیند کی خاموشی اور رات کی تاریکی میں گم ہے۔

اچانک تاریکی میں ایک متحرک تاریکی نمایاں ہوئی، سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا آدمی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ جا رہا ہے، وہ ایک گلی سے مڑ کر دوسری گلی اور دوسری گلی سے مڑ کر تیسری گلی میں پہنچا۔ ایک مکان کے سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا، اب اس نے لمبی سانس لی، گویا یہ مدت کی بند سانس تھی جسے اب آزادی سے ابھرنے کی مہلت ملی ہے۔ پھر اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی یقیناً تین پہر رات گزر چکی ہے، وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ "مگر کیا بدنصیبی ہے جس طرف گیا، ناکامی ہوئی، کیا پوری رات اسی طرح گزر جائے گی؟"

یہ خوفناک ابن ساباط ہے جو دس برس کی طول وطویل زندگی قید خانے میں گزارنے کے بعد اب کسی طرح نکل بھاگا ہے اور نکلنے کے ساتھ ہی اپنا قدیم پیشہ از سر نو شروع کر رہا ہے، یہ اس کی نئی مجرمانہ زندگی کی پہلی رات ہے، اس لئے وقت کے بے نتیجہ ضائع ہو جانے پر اس کا بے صبر دل پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

اس نے ہر طرف کی آہٹ لی، زمین سے کان لگا کر دور دور کی صداؤں کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر آگے بڑھا، کچھ دور چل کر اس نے دیکھا کہ ایک احاطہ کی دیوار دور تک چلی گئی ہے اور وسط میں ایک بہت بڑا پھاٹک ہے، کرخ کے اس علاقے میں زیادہ تر امراء کے باغ تھے یا سوداگروں کے گودام تھے، اس نے خیال کیا، یہ احاطہ یا تو کسی امیر کا باغ ہے یا کسی سوداگر کا

گودام، وہ پھاٹک کے پاس پہنچ کر رک گیا اور سوچنے لگا، اندر کیوں کر جائے اس نے آہستگی کے ساتھ دروازہ پر ہاتھ رکھا لیکن اسے نہایت تعجب ہوا کہ وہ اندر سے بند نہیں تھا، صرف بھڑا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر ابن ساباط کے قدم احاطہ کے اندر پہنچ گئے۔

اس نے دہلیز سے قدم آگے بڑھایا۔ تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا، اس کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے تھے اور وسط میں نسبتاً ایک بڑی عمارت تھی، وہ درمیانی عمارت کی طرف بڑھا، عجیب بات ہے کہ اس کا دروازہ بھی اندر سے بند نہیں تھا۔ چھوتے ہی اندر سے کھل گیا گویا وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا، یہ ایک بیباکی تھی جو صرف مشاق مجرموں ہی کے قدم میں ہو سکتی ہے، اندر چلا گیا، اندر جا کر دیکھا تو ایک وسیع ایوان تھا۔ صرف ایک کھجور کے پتوں کی پرانی چٹائی بچھی تھی، اور ایک طرف چمڑے کا تکیہ پڑا تھا البتہ ایک طرف پشمینہ کے موٹے کپڑے کے بہت سے تھان اس طرح بے ترتیب پڑے تھے گویا کسی نے جلدی میں پھینک دیئے ہوں اور ان کے قریب ہی بھیڑ کی کھال کی چند ٹوپیاں بھی پڑی تھیں، اس نے مکان کے موجودات کا یہ پورا جائزہ کچھ ہی دیر میں اپنی اندھیرے میں دیکھ لینے والی آنکھوں سے لے لیا تھا۔ یہ بغداد والوں کی بول چال میں ایک ہاتھ کا شیطان تھا جو اب پھر قید و بند کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گیا تھا۔

دس برس کی قید کے بعد آج ابن ساباط کو پہلی مرتبہ موقع ملا تھا کہ اپنے دل پسند کام کی جستجو میں آزادی کے ساتھ نکلے جب اس نے دیکھا کہ اس مکان میں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اور یہ پہلا قدم بیکار ثابت ہوگا تو اس کے تیز اور بے لگام جذبات سخت مشتعل ہو گئے، وہ دل ہی دل میں اس مکان میں رہنے والوں کو گالیاں دینے لگا جو اپنے مکان میں رکھنے کے لئے قیمتی اشیاء فراہم نہ کر سکے۔

ایک مفلس کا افلاس خود اس کے لئے اس قدر دردانگیز نہیں ہوتا۔ جس قدر اس چور کے لئے جو رات کے پچھلے پہر مال و دولت کو تلاش کرتا ہوا پہنچا ہے، اس میں شک نہیں کہ پشمینہ کے بہت سے تھان یہاں موجود تھے اور وہ کتنے ہی موٹے اور ادنی قسم کے کیوں نہ ہوں مگر پھر بھی اپنی قیمت رکھتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ ابن ساباط تنہا تھا اور صرف تنہا ہی

نہیں تھا بلکہ دو ہاتھوں کی جگہ صرف ایک ہاتھ رکھتا تھا، وہ ہزار ہمت کرتا، اتنا بڑا بوجھ اس کے سنبھالے سنبھل نہ سکتا تھا، اور وہ تھانوں کی موجودگی پر معترض نہ تھا، ان کے وزن کی گرانی اور اپنی مجبوری پر متاسف تھا، اتنی وزنی چیز چرا کر لے جانا آسان نہ تھا۔

"ایک ہزار لعنت کرخ اور اس کے باشندوں پر" وہ اندر ہی اندر بڑبڑانے لگا "نہیں معلوم! یہ کون احمق ہے جس نے یہ ملعون تھان جمع کر رکھے ہیں؟ غالباً کوئی تاجر ہے لیکن یہ عجیب طرح کا تاجر ہے جسے بغداد میں تجارت کرنے کے لئے اور کوئی چیز نہیں ملی! اتنا بڑا مکان بنا کر اس میں گدھوں اور خچروں کی جھول بنانے کا سامان جمع کر دیا" اس نے اپنے ایک ہی ہاتھ سے ایک تھان کو ٹٹول ٹٹول کر پیمائش کی، بھلا یہ ملعون بوجھ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے؟ ایک تھان کے اٹھانے کے لئے گن کر دس گدھے ساتھ لانے چاہئیں۔

لیکن بہر حال کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا، رات جا رہی تھی اور اب وقت نہ تھا کہ دوسری جگہ تاکی جائے، اس نے جلدی سے ایک تھان کھولا اور اسے فرش پر بچھا دیا، پھر کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ تھان جو اٹھائے جا سکتے ہوں، اٹھا لے، مشکل یہ تھی کہ مال کم قیمت مگر بہت وزنی تھا، کم لیتا ہے تو بے کار ہے، زیادہ لیتا ہے تو لے جا نہیں سکتا، عجیب طرح کی کشمکش میں گرفتار تھا، بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ مسئلہ طے ہوا لیکن اب دوسری مشکل پیش آئی، صوف کا کپڑا بے حد موٹا تھا، اسے مروڑ دے کر گرہ لگانا آسان نہ تھا۔

دونوں ہاتھوں سے بھی یہ کام مشکل تھا، چہ جائیکہ ایک ہاتھ سے؟ بلاشبہ اس کے پاس ہاتھ کی طرح پاؤں ایک نہ تھا، دو تھے لیکن وہ بھاگنے میں مدد دے سکتے تھے، اس نے بہت سی تجویزیں سوچیں، طرح طرح کے تجربے کئے، دانتوں سے کام لیا، کٹی ہوئی کہنی سے سرا دبایا لیکن کسی طرح بھی گٹھڑی میں گرہ نہ لگ سکی، وقت کی مصیبتوں میں تاریکی کی شدت نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔

اندرونی جذبات کے ہیجان اور بیرونی فعل کی بے سود محنت نے ابن ساباط کو بہت جلد تھکا دیا تھا۔ وقت کی کمی، عمل کا قدرتی خوف، مال کی گرانی، محنت کی شدت اور فائدہ کی قلت اس کے دفاع کے لئے تمام مخالف تاثرات جمع ہو گئے تھے۔

اچانک وہ چونک اٹھا،اس کی تیز قوت سماعت نے کسی کے قدموں کی نرم آہٹ سنی،ایک لمحہ تک خاموشی چھائی رہی، پھرایسا محسوس ہوا جیسے کوئی آدمی دروازے کے پیچھے کھڑا ہے،ابن ساباط گھبرا کر اٹھ بیٹھا، مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی حرکت کر سکے،دروازہ کھلا اور روشنی نمایاں ہوئی،خوف اور دہشت سے اس کا خون منجمد ہو گیا۔ جہاں کھڑا تھا،وہیں گڑ گیا، نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک شخص کھڑا ہے،اس کے ایک ہاتھ میں شمعدان ہے اور اسے اس طرح اونچا کر رکھا ہے کہ کمرے کے تمام حصے روشن ہو گئے ہیں۔

اس شخص کی وضع قطع سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا، ملگجے رنگ کی ایک لمبی سی عبااس کے جسم پر تھی جسے کمر کے پاس ایک موٹی رسی لپیٹ کر جسم پر چست کر دیا تھا۔ سر پر سیاہ قلنسوہ (اونچی دیوار کی ٹوپی) تھی اور اس قدر کشادہ تھی کہ اس کے کنارے ابروؤں کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ جسم نہایت نحیف تھا اتنا نحیف کہ صوف کی موٹی عبا پہننے پر بھی اندر کی ابھری ہوئی ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور قد کی درازی سے کمر کے پاس خفیف سی خمیدگی پیدا ہو گئی تھی،اس نے یہ نحافت اور زیادہ نمایاں کر دی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جسم کی اس غیر معمولی نحافت کا کوئی اثر اس کے چہرے پر نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا کمزور جسم رکھنے پر بھی اس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کا تاثر و گہرائی رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے پر ایک شاندار اور دلاویز چہرہ جوڑ دیا گیا ہے،رنگت زرد تھی،رخسار بے گوشت تھے، جسمانی تنومندی کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن پھر بھی چہرہ کی مجموعی ہیئت میں کوئی ایسی شاندار چیز تھی کہ دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ ایک نہایت طاقت ور چہرہ اس کے سامنے ہے۔ خصوصاً اس کی نگاہیں ایسی روشن،ایسی مطمئن،ایسی ساکن تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دنیا کی ساری راحت اور سکون انھی دو حلقوں کے اندر سما گئی ہے،چند لمحوں تک یہ شخص شمع اونچی کئے ابن ساباط کو دیکھتا رہا پھر اس طرح آگے بڑھا، گویا اسے جو کچھ سمجھنا تھا سمجھ چکا ہے،اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم زیر لب تھا،ایسا دلآویز اور شیریں تبسم جس کی موجودگی انسانی روح کے سارے اضطراب اور خوف دور کر سکتی ہے۔

چند لمحوں تک یہ شخص شمع اونچی کئے ابن ساباط کو دیکھتا رہا، اس نے شفقت اور

ہمدردی میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ ابن ساباط سے کہا۔

"میرے دوست! تم پر خدا کی سلامتی ہو جو کام تم کرنا چاہتے ہو۔ یہ بغیر روشنی اور رفیق کے انجام نہیں پا سکتا، دیکھ یہ شمع روشن ہے اور میں تمہاری رفاقت کے لئے موجود ہوں، روشنی میں ہم دونوں اطمینان اور سکون کے ساتھ یہ کام انجام دے لیں گے"۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رکا جیسے کچھ سوچنے لگا ہے، پھر اس نے کہا۔ "مگر میں دیکھتا ہوں تم بہت تھک گئے ہو، تمہاری پیشانی پسینہ سے تر ہو گئی ہے۔ یہ گرم موسم، بند کمرہ، تاریکی میں ایسی سخت محنت، افسوس، انسان کو اپنے رزق کے لئے کیسی کیسی زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، دیکھو! یہ چٹائی بچھی ہے، یہ چمڑے کا تکیہ ہے، میں اسے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں" اس نے تکیہ دیوار کے ساتھ رکھ دیا "بس ٹھیک ہے! اب تم اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر یہاں بیٹھ جاؤ اور اچھی طرح ستالو! اتنی دیر میں تمہارا ادھورا کام پورا کئے دیتا ہوں"

اس نے یہ کہا اور ابن ساباط کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ دیا، اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا پھر جب اس کی نظر دوبارہ اس کی عرق آلودگی پر پڑی تو اس نے اپنی کمر سے رومال کھول کر پسینہ صاف کیا، اس کی آنکھوں میں باپ کی سی شفقت اور ہاتھوں میں بھائی کی سی محبت کام کر رہی تھی۔

صورت حال کے یہ تمام تغیرات اس تیزی سے ظہور میں آئے کہ ابن ساباط کا دماغ مختل ہو کر رہ گیا، وہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے، ایک مدہوش اور بے ارادہ آدمی کی طرح اس نے اجنبی کے اشارہ کی تعمیل کی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اب اس نے دیکھا کہ واقعی اجنبی نے کام شروع کر دیا ہے، اس نے پہلے وہ گٹھڑی کھولی جو ابن ساباط نے باندھی تھی مگر بندھی نہیں تھی۔ پھر دو تھان کھول کر بچھا دیئے اور جس قدر بھی تھان موجود تھے، ان سب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ میں زیادہ تھے، ایک میں کم،، پھر دونوں کی الگ الگ دو گٹھڑیاں باندھ لیں، یہ تمام کام اس نے اس اطمینان اور سکون کے ساتھ کیا گویا اس میں اس کے لئے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ پھر اچانک اسے کچھ خیال آیا اس نے اپنی عبا اتار ڈالی اور اسے بھی گٹھڑی کے اندر رکھ دیا، اب وہ اٹھا اور ابن ساباط

کے قریب گیا۔

"میرے دوست! تمہارے چہرے کی پژمردگی سے معلوم ہوتا ہے کہ تم صرف تھکے ہوئے ہی نہیں ہو بلکہ بھوکے بھی ہو، بہتر ہوگا کہ چلنے سے پہلے دودھ کا ایک پیالہ لے لو! اگر تم چند لمحے انتظار کر سکو تو میں دودھ لے آؤں" اس نے کہا، جب کہ اس کے پر شکوہ چہرے پر بدستور دلآویز مسکراہٹ موجود تھی، ممکن نہ تھا کہ اس مسکراہٹ سے انسانی قلب کے تمام اضطراب محو نہ ہو جائیں قبل اس کے کہ ابن ساباط جواب دے وہ تیزی کے ساتھ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

اب ابن ساباط تنہا تھا لیکن تنہا ہونے پر بھی اس کے قدموں میں حرکت نہ ہوئی اجنبی کے طرز عمل میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کے اندر خوف پیدا ہوتا۔ وہ صرف متحیر اور مبہوت تھا۔ اجنبی کی ہستی اور اس کا طور طریقہ ایسا عجیب و غریب تھا کہ جب تک وہ موجود رہا، ابن ساباط کو تحیر و تاثر نے سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اس کی شخصیت مغلوب ہو گئی تھی لیکن اب وہ تنہا ہوا، آہستہ آہستہ اس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر آ گیا، یہاں تک کہ تمام دماغی خصائل پوری طرح ابھر آئے اور وہ اسی روشنی میں معاملات دیکھنے لگا جس روشنی میں دیکھنے کا ہمیشہ عادی تھا۔

وہ جب اجنبی کا تبسم اور دلنواز صدائیں یاد کرتا تو شک اور خوف کی جگہ اس کے اندر ایک ایسا ناقابل فہم جذبہ پیدا ہوتا جو آج تک اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا، لیکن پھر جب وہ سوچتا کہ تمام معاملہ کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ شخص ہے کون؟ تو اس کی عقل حیران رہ جاتی اور کوئی بات سمجھ میں نہ آتی، اس نے اپنے دل میں کہا یہ تو قطعی ہے کہ یہ شخص اس مکان کا مالک نہیں ہے، مکان کے مالک کبھی چوروں کا اس طرح استقبال نہیں کرتے۔ پھر یہ شخص ہے کون؟

اچانک ایک نیا خیال اس کے اندر پیدا ہوا وہ ہنسا، استغفر اللہ! میں بھی کیا احمق ہوں، یہ بھی کوئی سوچنے اور حیران ہونے کی بات ہے، معاملہ بالکل صاف ہے، تعجب ہے، مجھے پہلے کیوں خیال نہیں ہوا؟ یقیناً یہ بھی میرا کوئی ہم پیشہ آدمی ہے اور اسی نواح میں رہتا ہے، اتفاقات نے آج ہم دونوں چوروں کو ایک ہی مکان میں جمع کر دیا ہے چونکہ یہ اسی نواح کا

آدمی ہے اس لئے اس مکان کے تمام حالات سے واقف ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ آج مکان رہنے والوں سے خالی ہے اور یہ اطمینان سے کام کرنے کا موقع ہے، اسی لئے وہ روشنی کا سامان ساتھ لے کر واپس آیا لیکن جب دیکھا کہ میں پہلے سے پہنچا ہوا ہوں تو آمادہ ہو گیا کہ میرا ساتھ دے کر ایک حصہ کا حقدار بن جائے۔ وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور اجنبی ایک لکڑی کا بڑا پیالہ ہاتھ میں لئے نمودار ہو گیا۔

"یہ لو! تمہارے لئے دودھ لایا ہوں، اسے پی لو! یہ بھوک اور پیاس دونوں کے لئے مفید ہے" اس نے کہا اور پیالہ ابن ساباط کو پکڑا دیا، ابن ساباط واقعی بھوکا اور پیاسا تھا، بلا تامل منہ لگالیا اور ایک ہی مرتبہ میں ختم کر دیا۔ اب اسے معاملہ کی فکر ہوئی، اتنی دیر کے وقفہ نے اس کی طبیعت بحال کر دی تھی۔

"دیکھو! اگرچہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچا ہوں اور ہاتھ لگا چکا تھا، اس لئے ہم لوگوں کے قاعدہ کے بموجب تمہارا کوئی حق نہیں لیکن تمہاری ہوشیاری اور مستعدی دیکھ لینے کے بعد مجھے کوئی تامل نہیں کہ تمہیں بھی اس مال میں شریک کر لوں گا لیکن دیکھ یہ میں کہے دیتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی یہاں سے لے جائیں گے اس میں تم برابر کا حصہ نہیں پا سکتے کیونکہ دراصل آج میرا ہی کام تھا"

اس نے صاف آواز میں کہا، اس کی آواز میں اب تاثر نہیں تھا، تحکم تھا، اجنبی مسکرایا! اس نے ابن ساباط پر ایک ایسی نظر ڈالی جو اگرچہ شفقت و مہر سے خالی نہ تھی لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں کوئی چیز تھی۔ لیکن ابن ساباط نہ سمجھ سکا۔ اس نے خیال کیا شاید یہ شخص اس طریق تقسیم پر قانع نہیں ہے، اچانک اس کی آنکھوں میں اس کی خوفناک مجرمانہ درندگی چمک اٹھی، وہ غصہ سے مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"بے وقوف! چپ کیوں ہے؟ یہ نہ سمجھنا کہ دودھ کا ایک گلاس پلا کر اور چکنی چپڑی باتیں کر کے تم احمق بنا لو گے، تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں؟ مجھے کوئی احمق نہیں بنا سکتا، میں ساری دنیا کو احمق بنا چکا ہوں، بولو، اس پر راضی ہو کہ نہیں؟ اگر نہیں تو............"

لیکن ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اجنبی کے لب متحرک ہوئے اب بھی اس کے لبوں سے اس کی مسکراہٹ نہیں ہٹی تھی:

"میرے عزیز دوست! کیوں بلاوجہ اپنی طبیعت آزردہ کرتے ہو؟ آؤ یہ کام جلدی نمٹالیں جو ہمارے سامنے ہے، دیکھو میں نے دو گٹھڑیاں باندھ لی ہیں، ایک چھوٹی ہے، ایک بڑی ہے، تمہارا ایک ہاتھ ہے، اس لئے تم زیادہ بوجھ نہیں سنبھال سکتے لیکن میں دونوں ہاتھوں سے سنبھال لوں گا، چھوٹی گٹھڑی تم اٹھالو، بڑی میں اٹھالیتا ہوں، باقی رہا حصہ جس کے خیال سے تمہیں اتنی آزردگی ہوئی ہے تو میں بھی نہیں چاہتا کہ اس وقت اس کا فیصلہ کراؤں تم نے کہا ہے کہ تم ہمیشہ کے لئے میرے ساتھ معاملہ کر سکتے ہو، مجھے بھی ایسا ہی معاملہ پسند ہے میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے معاملہ کرلو"۔

"ہاں، اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے تمہیں ابھی معلوم نہیں میں کون ہوں؟ پورے ملک میں تمہیں مجھ سے بہتر سردار نہیں مل سکتا"...... اس نے بڑی گٹھڑی کے اٹھانے میں اجنبی کو مدد دیتے ہوئے کہا۔

گٹھڑی اس قدر بھاری تھی کہ ابن ساباط اپنی حیرانی نہ چھپا سکا، وہ اگرچہ اپنے نئے رفیق کی زیادہ جرات افزائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا، پھر بھی اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا، "دوست! تم دیکھنے میں تو بڑے دبلے پتلے ہو لیکن بوجھ اٹھانے میں بڑے مضبوط نکلے"۔

ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں کہا" یہ جتنا مضبوط ہے اتنا عقلمند نہیں ہے ورنہ اپنے حصے سے دست بردار نہ ہو جاتا، اگر آج یہ احمق نہ مل جاتا تو مجھے سارا چھوڑ کر صرف دو تھانوں پر قناعت کرلینی پڑتی"۔

اب ابن ساباط نے اپنی گٹھڑی اٹھائی جو بہت ہی ہلکی تھی اور دونوں باہر نکلے، اجنبی کی پیٹھ جس میں پہلے سے خم موجود تھا، اب گٹھڑی کے بوجھ سے بالکل ہی جھک گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر چلنا نہایت دشوار تھا لیکن ابن ساباط کو قدرتی طور پر جلدی تھی، وہ بار بار حاکمانہ انداز سے اصرار کرتا کہ تیز چلو اور چونکہ خود اس کا بوجھ ہلکا تھا، اس لئے

خود تیز چلنے میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کرتا تھا، اجنبی تعمیل حکم کی پوری کوشش کرتا، لیکن اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر دوڑنا انسانی طاقت سے باہر تھا، اس لئے پوری کوشش کرنے پر بھی زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹھوکریں لگیں، بار بار بوجھ گرتے گرتے رہ گیا، ایک مرتبہ اتنی سخت چوٹ کھائی کہ قریب تھا کہ گر جائے پھر بھی اس نے رکنے یا ستانے کا نام نہیں لیا، گرتا پڑتا اپنے ساتھی کے ساتھ چلتا رہا۔

لیکن ابن ساباط اس پر بھی خوش نہ تھا، اس نے پہلے تو ایک دو مرتبہ تیز چلنے کا حکم دیا پھر وہ بے تامل گالیوں پر اتر آیا۔ ہر لمحہ کے بعد ایک سخت گالی دیتا اور کہتا تیز چلو، اتنے میں پل آیا، یہاں چڑھائی تھی، جسم کمزور اور تھکا ہوا، بوجھ بے حد بھاری، اجنبی سنبھل نہ سکا اور بے اختیار گر گیا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اوپر سے سخت لات پڑی یہ ابن ساباط کی لات تھی، اس نے غضبناک ہو کر کہا

"کتے کے بچے! اگر اتنا بوجھ سنبھال نہیں سکتا تھا تو لاد کر لایا کیوں"

اجنبی ہانپتا ہوا اٹھا، اس کے چہرہ پر درد و شکایت کی بجائے شرمندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ اس نے فوراً گٹھڑی اٹھا کر پیٹھ پر رکھی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب یہ دونوں شہر کے کنارے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو بہت ہی کم آباد تھی۔ یہاں ایک ناتمام عمارت کا پرانا اور شکستہ حصہ تھا، ابن ساباط اس احاطہ کی ایک جانب پہنچ کر رک گیا۔ اور اجنبی سے کہا "یہیں بوجھ اتار دو پھر خود کود کر اندر گیا، اور اجنبی نے باہر سے دونوں گٹھڑیاں اندر پھینک دیں، اس کے بعد اجنبی کود کر اندر ہو گیا، اور دونوں عمارت کے اندرونی حصہ میں پہنچ گئے، اس عمارت کے نیچے ایک پرانا تہہ خانہ تھا جس میں ابن ساباط نے قید خانے سے نکل کر پناہ لی تھی، لیکن اس وقت وہ سرداب میں نہیں اترا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اجنبی پر ابھی اس درجہ اعتماد کرے کہ اپنا اصلی محفوظ مقام دکھلا دے۔

جس جگہ یہ دونوں کھڑے تھے، دراصل ایک ناتمام ایوان تھا یا تو اس پر پوری چھت پڑی ہی نہ تھی یا پڑی تھی تو امتداد وقت سے شکستہ ہو کر گر پڑی تھی، ایک طرف بہت سے پتھروں میں سے ایک پر بیٹھ گیا، دونوں گٹھڑیاں سامنے دھری تھیں، ایک گوشہ میں

اجنبی کھڑا ہانپ رہا تھا، کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

یکایک اجنبی بڑھا اور ابن ساباط کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اب رات ختم ہونے پر تھی، پچھلے پہر کا چاند درخشاں تھا۔ کھلی چھت سے اس کی دھیمی اور ظلمت آلود شعاعیں ایوان کے اندر پہنچ رہی تھیں، ابن ساباط دیوار کے سائے میں تھا۔ لیکن اجنبی جو اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا، ٹھیک چاند کے مقابل تھا اس لئے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا، ابن ساباط نے دیکھا کہ تاریکی میں ایک درخشاں چہرہ، ایک نورانی تبسم، ایک پراسرار انداز نگاہ کی دلآویزی اس کے سامنے ہے۔

"میرے عزیز! دوست اور رفیق!

اجنبی نے اپنی دلنواز اور شیریں آواز میں جو دو گھنٹہ پہلے ابن ساباط کو بے خود کر چکی تھی کہنا شروع کیا۔

"میں نے اپنی خدمت پوری کر لی ہے، اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں، اس کام کے کرنے میں مجھ سے جو کمزوری اور سستی ظاہر ہوئی اور اس کی وجہ سے بار بار تمہیں پریشان خاطر ہونا پڑا، اس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔ اس دنیا میں ہماری کوئی بات بھی خدا کے کاموں سے ملتی جلتی نہیں ہے جس قدر یہ بات کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور بخش دیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تم سے الگ ہوں تمہیں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم نے خیال کیا ہے، میں اسی مکان میں رہتا ہوں جہاں آج تم سے ملاقات ہوئی ہے اور تم نے میری رفاقت قبول کر لی تھی۔ میری عادت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر کے لئے اس کمرے میں جایا کرتا ہوں، جہاں تم بیٹھے تھے۔ آج آیا تو دیکھا! تم اندھیرے میں بیٹھے تکلیف اٹھا رہے ہو۔ تم میرے گھر میں عزیز مہمان تھے افسوس میں آج اس سے زیادہ تمہاری تواضع اور خدمت نہیں کر سکا، تم نے میرا مکان دیکھ لیا ہے، آئندہ جب کبھی ضرورت ہو تم بلا تکلف اپنے رفیق کے پاس چلے آسکتے ہو، خدا کی سلامتی اور برکت ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے"۔

یہ کہا اور آہستگی کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا اور تیزی

کے ساتھ نکل کر روانہ ہو گیا۔

اجنبی خود تو روانہ ہو گیا لیکن ابن ساباط کو ایک نئے عالم میں پہنچادیا۔ اب وہ مبہوت اور مدہوش تھا، اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اسی طرف تک رہی تھیں، جس طرف اجنبی روانہ ہوا تھا۔ لیکن معلوم نہیں اسے کچھ سجھائی بھی دیتا تھا یا نہیں؟

دوپہر ڈھل چکی تھی، بغداد کی مسجدوں سے جوق در جوق نمازی نکل رہے ہیں۔ دوپہر کی گرمی نے امیروں کو تہہ خانوں اور غریبوں کو دیوار کے سائے میں بیٹھا دیا تھا اب دونوں نکل رہے ہیں، ایک تفریح کے لئے، دوسرا مزدوری کے لئے لیکن ابن ساباط اس وقت وہیں بیٹھا ہے، جہاں صبح بیٹھا تھا۔ رات والی دونوں گٹھڑیاں سامنے پڑی ہیں اور اس کی نظریں اس طرح ان میں گڑی ہیں گویا ان کی شکنوں کے اندر اپنے رات والے رفیق کو ڈھونڈ رہا ہے۔

دو گھنٹے گزر گئے لیکن جسم اور زندگی کی ضرورت بھی اسے محسوس نہیں ہوئی۔ وہ بھوک جس کی خاطر اس نے اپنا ایک ہاتھ کٹوا دیا تھا۔ اب اس کو نہیں ستاتی۔ وہ خوف جس کی وجہ سے سورج کی روشنی اس کے لئے دنیا کی سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز ہو گئی تھی، اب اسے محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ کی ساری قوت صرف ایک نقطہ میں سمٹ آئی تھی وہ رات والے عجیب و غریب اجنبی کی صورت تھی وہ خود اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اسے ایک ایسے عالم کی جھلک دکھا گئی جو اب تک اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا!

اس کی ساری زندگی گناہ اور سیہ کاریوں میں بسر ہوئی تھی، اس نے انسانوں کی نسبت جو کچھ دیکھا سنا تھا وہ یہی تھا کہ خود غرضی کا پتلا اور نفس پرستی کی مخلوق ہے، وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے، بے رحمی سے ٹھکرا دیتا ہے، سخت سے سخت سزائیں دیتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت بھی کرتا ہے اور اس میں فیاضی، بخشش اور قربانی کی روح بھی ہو سکتی ہے۔ بچپن میں اس نے بھی خدا کا نام سنا تھا اور لوگوں کو خدا پرستی کرتے دیکھا تھا۔ لیکن جب زندگی کی کشاکش کا میدان سامنے آیا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا، اس نے قدم اٹھا دیئے اور حالات کی رفتار جس طرف لے گئی، بڑھتا گیا، نہ تو خود اس کو کبھی مہلت ملی کہ خدا پرستی کی طرف متوجہ ہوتا اور نہ انسانوں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ اسے خدا سے آشنا

کرتے۔ جوں جوں اس کی شقاوت بڑھتی گئی، معاشرہ اپنی سزا و عقوبت کی مقدار بھی بڑھاتا گیا، معاشرہ کے پاس اس کی شقاوت کے لئے بے رحمی تھی، اس لئے یہ بھی دنیا کی ساری چیزوں میں سے صرف بے رحمی کا خوگر ہو گیا۔

لیکن اب اچانک اس کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا، آسمان کے سورج کی طرح محبت کا بھی ایک سورج ہے، وہ چمکتا ہے تو روح اور دل کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، اب یکایک اس سورج کی پہلی کرن ابن ساباط کے دل کے تاریک گوشوں پر پڑی اور وہ یک دم تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔

اجنبی کی شخصیت اپنی پہلی ہی نظر میں اس کے دل تک پہنچ چکی تھی۔ لیکن وہ جہالت و گمراہی سے اس کا مقابلہ کرتا رہا اور حقیقت کے فہم کے لئے تیار نہیں ہوا لیکن جونہی اجنبی کے آخری الفاظ نے پردہ ہٹا دیا جو اس نے اپنی آنکھوں پر ڈال لیا تھا حقیقت اپنی پوری شان تاثیر کے ساتھ بے نقاب ہو گئی اور اب اس کی طاقت سے یہ بات باہر تھی کہ اس تیر کے زخم سے اپنا سینہ بچا لے جاتا!

اس نے پہلے اپنی جہالت سے خیال کیا تھا کہ اجنبی بھی میری ہی طرح کا ایک چور ہے اور اپنا حصہ لینے کے لئے میری رفاقت اور اعانت کر رہا ہے اس کا ذہن یہ تصور کر ہی نہیں سکتا تھا کہ بغیر غرض اور انتفاع کے ایک انسان دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتا ہے۔ لیکن جب اجنبی نے چلتے وقت بتلا دیا کہ وہ چور نہیں بلکہ اسی مکان کا مالک ہے جس مکان کا مال و متاع غارت کرنے کے لئے وہ گیا تھا، تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک بجلی آسمان سے گر پڑی۔

"یہ چور نہیں تھا، مکان کا مالک تھا، لیکن اس نے چور کو پکڑنے اور سزا دلوانے کی جگہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟"

اس سوال کا جواب اس کی روح کے لئے ایک دہکتا انگارہ تھا اور دل کے لئے ایک ناسور تھا، وہ جس قدر سوچتا، روح کا زخم گہرا ہو جاتا اور دل کی تپش بڑھتی جاتی، اس تمام عرصہ میں اجنبی کے ساتھ جو کچھ گزرا تھا، اس کا ایک ایک واقعہ، ایک ایک حرف یاد کرتا اور ہر بات

کی یاد کے ساتھ ایک تازہ زخم کی چبھن محسوس کرتا جب ایک مرتبہ حافظہ میں یہ سرگزشت ختم ہو جاتی تو پھر نئے سرے سے یاد کرنا شروع کر دیتا اور آخر تک پہنچا کر پھر ابتدا کی طرف لوٹتا۔

میں اس کے یہاں چوری کرنے کے لئے گیا تھا، میں اس کا مال و متاع غارت کرنا چاہتا تھا، میں نے اسے بھی چور سمجھا، اسے گالیاں دیں، بے رحمی سے ٹھوکر لگائی، مگر اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟ ہر مرتبہ اس آخری سوال کا جواب سوچتا اور پھر یہی سوال دہرانے لگتا۔

سورج ڈوب رہا تھا، بغداد کی مسجدوں کے میناروں پر مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں، ابن ساباط بھی اپنے غیر آباد گوشہ سے اٹھا، چادر جسم پر ڈالی اور بغیر کسی جھجک کے باہر نکل گیا، اب اس کے دل میں خوف نہیں تھا کیونکہ خوف کی جگہ ایک دوسرے ہی جذبے نے لے لی تھی۔

وہ کرخ کے اسی حصے میں پہنچا جہاں گزشتہ رات گیا تھا، رات والے مکان کے پہچاننے میں اسے بہت دقت پیش نہیں آئی، مکان کے پاس ہی ایک لکڑہارے کا جھونپڑا تھا، یہ اس کے پاس گیا اور پوچھا۔

"یہ جو سامنے بڑا سا احاطہ ہے اس میں کون تاجر رہتا ہے؟"

"تاجر"...... بوڑھے لکڑہارے نے تعجب کے ساتھ کہا:

"معلوم ہوتا ہے تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو یہاں تاجر کہاں سے آیا؟ یہاں تو شیخ جنید بغدادیؒ رہتے ہیں"۔

ابن ساباط اس نام کی شہرت سے بے خبر نہ تھا لیکن صورت آشنا نہ تھا۔

ابن ساباط مکان کی طرف چلا، رات کی طرح اس وقت بھی دروازہ کھلا تھا، یہ بے تامل اندر چلا گیا، سامنے وہی رات والا ایوان تھا۔ یہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور دروازہ کے اندر نگاہ ڈالی، وہی رات والی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ رات والا تکیہ ایک جانب دھرا تھا۔ تکیہ سے سہارا لگائے عجیب اجنبی بیٹھا تھا، تیس چالیس آدمی سامنے تھے۔ واقعی اجنبی تاجر نہیں، شیخ

بغدادیؒ تھے۔

اتنے میں عشا کی اذان ہوئی، لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، سب لوگ جا چکے تو شیخ بھی اٹھے، جونہی انہوں نے دروازہ کے باہر قدم رکھا، ایک شخص بے تابانہ بڑھا اور قدموں میں گر گیا یہ ابن ساباط تھا، اس کے دل میں سمندر کا تلاطم بند تھا، آنکھوں میں جو کبھی تر نہیں ہوئی تھیں دجلہ کی سوتیں بھر گئی تھیں۔ دیر تک رکی رہیں مگر اب نہیں رک سکتی تھیں۔ آنسوؤں کا سیلاب آجائے تو پھر دل کی کون سی کثافت ہے جو باقی رہ سکتی ہے۔

شیخ نے شفقت سے اس کا سر اٹھایا، یہ کھڑا ہو گیا مگر زبان نہ کھل سکی، اور اب اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ جب دل کی آنکھوں کی زبان کھل جاتی ہے تو منہ کی زبان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گزر چکا ہے شیخ احمد بن ساباط کا شمار سید الطائفہ کے حلقہ ارادت کے ان فقراء میں ہے جو سب میں پیش پیش ہیں شیخ کہا کرتے۔

"ابن ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی جو دوسرے برسوں میں بھی طے نہیں کر سکے" ابن ساباط کو ۴۰ برس تک دنیا کی دہشت انگیز سزائیں نہ بدل سکیں مگر محبت اور قربانی کے ایک لمحہ نے چور سے اہل اللہ بنا دیا۔

☆☆☆☆

کتابیات

۱)...الاصابہ..........................حافظ ابن حجرؒ

۲)...ارشاد الساری......................احمد بن محمد قسطلانیؒ

۳)...اولیاء اللہ کے اخلاق..................نصیر حسین نقشبندی

۴)...الافاضات الیومیہ....................حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

۵)...امام ابن ماجہ اور علم حدیث..............مولانا عبدالرشید نعمانیؒ

۶)...احیاء العلوم........................امام محمد بن محمد غزالیؒ

۷)...اسد الغابہ..........................عزالدین ابن الاثیر جزریؒ

۸)...آپ بیتی..........................شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ

۹)...آواز دوست.........................مختار مسعود

۱۰)...الانساب..........................عبدالکریم بن محمد سمعانی

۱۱)...بزم رفتہ کی سچی کہانیاں................صباح الدین عبدالرحمٰن

۱۲)...البدایہ والنہایہ......................حافظ اسماعیل ابن کثیر

۱۳)...بخاری کی باتیں......................امین گیلانی

۱۴)...البلاغ............................ترجمان دارالعلوم کراچی

۱۵)...بغیۃ الوعاۃ.........................جلال الدین سیوطی

۱۶)...البیان والتبیین......................علامہ جاحظ

۱۷)...پرانے چراغ........................مولانا ابوالحسن علی ندوی

۱۸)...تفسیر ابن کثیر.......................حافظ ابن کثیر

۱۹)... تفسیر کبیر.............................امام فخر الدین رازی
۲۰)... تہذیب الکمال.............................جمال الدین یوسف مزی
۲۱)... تاریخ فرشتہ.............................ابوالقاسم فرشتہ
۲۲)... تاریخ طبری.............................محمد بن جریر طبری
۲۳)... ترتیب المدارک.............................قاضی عیاض
۲۴)... تہذیب التہذیب.............................حافظ ابن حجر عسقلانی
۲۵)... تعلیقات رسالہ المسترشدین.............................شیخ عبدالفتاح ابو غدہ
۲۶)... التعالم واثرہ علی الفکر.............................بکر بن عبداللہ ابوزید
۲۷)... تفسیر صابونی.............................الشیخ محمد علی الصابونی
۲۸)... ترغیب المسلمین.............................مولانا محمد موسی روحانی بازی
۲۹)... تاریخ دعوت وعزیمت.............................مولانا ابوالحسن علی ندوی
۳۰)... ترقی.............................مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب بلند شہری
۳۱)... تالیف.............................ڈاکٹر خورشید احمد رضوی
۳۲)... تاریخ بغداد.............................احمد خطیب بغدادی
۳۴)... الجواب الکافی.............................علامہ ابن القیم
۳۵)... جہان دیدہ.............................مفتی محمد تقی عثمانی
۳۶)... جنہیں میں نے دیکھا.............................جناب کوثر نیازی
۳۷)... جہان دانش.............................احسان دانش مرحوم
۳۸)... جریدۃ الاشرف.............................ترجمان جامعہ اشرفیہ سکھر
۳۹)... حدائق الحنفیہ.............................فقیر محمد جہلمی
۴۰)... حلیۃ الاولیاء.............................ابو نعیم اصبہانی

۴۱)... حیات شیخ القرآن........................ مولانا محمد ابراہیم فانی
۴۲)... حیات الحیوان ....علامہ دمیری
۴۳)... خامہ بگوش کے قلم سے........................ مشفق خواجہ
۴۴)... الخیرات الحسان........................ابن حجر مکی
۴۵)... در مختار........................ محمد بن علی حصکفی
۴۶)... ذیل طبقات حنابلہ........................علامہ ابن رجب حنبلی
۴۷)... الذکریات .... محمد علی طنطاوی
۴۸)... رسالہ قشیریہ........................علامہ ابوالقاسم قشیری
۴۹)... رفیق المسلم فی الاسفار........................ منذر الاسعد
۵۰)... ماہنامہ الرشید مدنی واقبال نمبر............ ترجمان جامعہ رشیدیہ ساہیوال
۵۱)... رازِ حیات........................وحید الدین خان
۵۲)... روزگارِ فقیر........................ فقیر سید وحید الدین
۵۳)... رواداری اور مغرب........................ محمد صدیق شاہ
۵۴)... زیرو پوائنٹ........................جاوید چوہدری
۵۵)... سیرت حلبیہ........................ علی بن برہان الدین حلبی
۵۶)... سوانح مفتی محمد حسن........................
۵۷)... سیر اعلام النبلاء........................ شمس الدین بن محمد ذہبی
۵۸)... سیرۃ ابن ہشام........................ابو محمد عبداللہ بن ہشام
۵۹)... شرح مختصر ابن ابی جمرۃ........................علامہ شنوانی
۶۰)... شذرات الذہب........................ابن عماد حنبلی
۶۱)... شرح مقامات........................علامہ شریشی

۶۲)... شرح حماسہ.......... علامہ تبریزی
۶۳)... شہاب نامہ.......... قدرت اللہ شہاب
۶۴)... صفۃ الصفوۃ.......... امام ابن الجوزی
۶۵)... صحیح مسلم.......... امام مسلم بن الحجاج نیشاپوری
۶۶)... صحبتے با اہل حق.......... ملفوظات مولانا عبد الحق اکوڑہ خٹک
۶۷)... صید الخاطر.......... علامہ ابن جوزی
۶۸)... طبقات کبریٰ للسبکی.......... تاج الدین عبد الوہاب بن تقی الدین سبکی
۶۹)... العفو والاعتذار.......... ابو الحسن الرقام
۷۰)... عیون الاخبار.......... علامہ دینوری
۷۱)... عمدۃ القاری.......... علامہ بدر الدین عینی
۷۲)... غلط فہمی.......... سید امین گیلانی
۷۳)... فوات الوفیات.......... محمد بن شاکر کتبی
۷۴)... فوائد الفواد.......... ملفوظات خواجہ نظام الدین اولیاء
۷۵)... فتح الباری.......... ابن حجر عسقلانی
۷۶)... القضاء فی الاسلام.......... عارف نکدی
۷۷)... کتاب الدعاء.......... سلیمان بن احمد طبرانی
۷۸)... کتاب الثقات.......... ابو حاتم محمد بن حبان بستی
۷۹)... الکامل لابن اثیر.......... عز الدین علی بن محمد ابن الاثیر جزری
۸۰)... الکامل للمبرد.......... محمد بن یزید ابو العباس مبرد
۸۱)... کتابیں ہیں چمن اپنا.......... عبد المجید قریشی
۸۲)... کتاب الثقات.......... علامہ عجلی

۸۳)... کاروانِ زندگی.......................... مولانا ابوالحسن علی ندوی
۸۴)... کیفیات........................ زکی کیفی
۸۵)... کلیات اقبال........................ علامہ اقبال
۸۶)... اللقط فی حکایات الصالحین.................. علامہ ابن جوزی
۸۷)... المواہب اللدنیہ........................ علامہ زرقانی
۸۸)... مناقب الامام احمد........................ علامہ ابن جوزی
۸۹)... مقدمات الشیخ علی طنطاوی.................. شیخ علی طنطاوی
۹۰)... مجھے ہے حکم آذان...................... مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی
۹۱)... المستطرف فی کل فن مستظرف.................. محمد بن احمد ابشیہی
۹۲)... من الظلمت الی النور.................... پروفیسر ڈاکٹر غازی احمد
۹۳)... ماہنامہ الولی........................ ترجمانِ شاہ ولی اللہ اکیڈمی
۹۴)... المکارم والمفاخر........................ ابو بکر خوارزمی
۹۵)... میزان الاعتدال........................ علامہ ذہبی
۹۶)... متاع نور........................ مولانا رشید اشرف صاحب
۹۷)... المامون........................ علامہ شبلی نعمانی
۹۸)... ملفوظات مولانا انور شاہ کشمیری.............. مولانا رضا احمد بجنوری
۹۹)... المنتظم........................ علامہ ابن جوزیؒ
۱۰۰)... نقوش رفتگاں........................ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب
۱۰۱)... وفیات الاعیان........................ احمد بن محمد ابو بکر ابن خلکان
۱۰۲)... سہ ماہی وفاق........................ ترجمان وفاق المدارس العربیہ

☆☆☆☆☆☆